بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر

(۵)

سعدی علیہ الرحمہ نے کیا خوب کہا ہے۔

رعیت چو بیخ است و سلطاں درخت   درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

یہ جڑوں ہی کی مضبوطی تھی کہ دلی کا سرسبز و شاداب چمن اگرچہ حوادث زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا اور فلاکت کی بجلیوں اور باد مخالف کے جھونکوں سے سلطنت مغلیہ کی شوکت و اقتدار کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر دلی کو اپنی سلطنت میں شریک کرلے۔ مرہٹوں کا زور ہوا۔ پٹھانوں کا زور ہوا۔ جاٹوں کا زور ہوا۔ انگریزوں کا زور ہوا مگر دلی کا بادشاہ دلی کا بادشاہ ہی رہا۔ اور جب تک دلی بالکل تباہ نہ ہولی اسوقت تک کوئی نہ کوئی تخت پر بیٹھنے والا نکلتا ہی رہا۔ دلی کے رزیڈنٹ نے بہت کچھ چاہا کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی کردے۔ گورنر جنرل نے بڑی کوشش کی کہ شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کرکے قلعہ پر قبضہ کرلے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بہت زور مارا کہ دلی کی بادشاہت کا خاتمہ کردیا جائے۔ مگر یورپ والے اس پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ دلی کا بادشاہ کیا ہے اور اس کے اثرات کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مباحثے ہوئے نوجوانوں نے بہت کچھ جوش و خروش دکھایا۔ مگر انگلستان کے جہاندیدہ بڈھوں کے سامنے کچھ نہ چلی جب

ورڈ میں مسٹر ملکر نے کھڑے ہو کر کہا: "عزیزو! میں ۵۰ سال ہندوستان میں رہا ہوں۔ میں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ دلی کا قلعہ کیا ہے۔ اسکی بنیاد اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک۔ ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری جانب کاٹھیاواڑ تک۔ ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا تو وہ زلزلہ آئے گا کہ سارا ہندوستان ہل جائیگا۔ یہ بڑے نام کی بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔" آخر بورڈ میں بڈھے جیتے اور نوجوان ہارے۔

دلی کے بادشاہ کا اقتدار ضرور کم ہو گیا۔ مگر جو عقیدت رعایا کو بادشاہ سے تھی اس میں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور جو محبت بادشاہ کو رعایا سے تھی وہ جیسی کی ویسی رہی۔ رعایا کی وہ کونسی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں اور بادشاہ کا وہ کونسا رنج تھا جس میں رعایا شریک نہ ہوتی ہو بات یہ تھی کہ دونوں جانتے اور سمجھتے تھے کہ جو ہم ہیں وہ یہ ہیں اور جو یہ ہیں وہ ہم ہیں۔

شاہ عالمگیر ثانی کے قتل کے واقعہ ہی پر نظر ڈال لو۔ دیکھو کہ ہندو مرد تو مرد عورتوں کو بادشاہ سے کیسی محبت تھی۔ اور خود بادشاہ اس محبت کی کیسی قدر کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کو فقیروں سے بڑی عقیدت تھی۔ جہاں سن پاتے کہ کوئی فقیر آیا ہوا ہے اس کو بلاتے۔ نہ آتا تو خود جاتے۔ اس سے ملتے بہت کچھ دیتے دلاتے۔ اور اس فقیر نوازی کو توشۂ آخرت سمجھتے۔ غازی الدین خاں اس زمانہ میں دلی کا وزیر تھا۔ خدا جانے اس کو بادشاہ سے کیوں دلی نفرت تھی۔ قلعہ میں تو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ دھوکے سے بادشاہ کو مارنے کا جال پھیلایا۔ قلعہ میں مشہور کر دیا کہ پرانے کوٹلہ میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں بڑے صاحب کرامات ہیں۔ بڑے خدا رسیدہ ہیں۔ مگر نہ کہیں خود جاتے ہیں نہ کسی کو آنے دیتے ہیں۔ ادھر بادشاہ کو ملنے کا شوق ہوا۔ ادھر لوگوں نے شاہ صاحب کی کرامتوں کے اور پل باندھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رات بادشاہ تن تنہا قلعہ سے نکلکر کوٹلہ پہونچے۔ ادھر ادھر ڈھونڈا میں تلاش کی۔ یہاں تو پہلے ہی سے دشمن لگے ہوئے تھے۔ چار نمک حراموں نے ایک برج میں سے نکلکر بادشاہ کو شہید کر دیا۔ اور لاش جمنا کی ریتی میں پھینکدی۔ خدا کی قدرت دیکھو ادھر سے ایک برہمنی رام کور آ رہی تھی اس نے جو لاش پڑی دیکھی تو ذرا ٹھٹکی۔ بھاگنے کا ارادہ کیا۔ پھر ذرا غور کیا تو کیا دیکھتی ہے کہ ہیں یہ تو بادشاہ سلامت کی لاش ہے۔ رات بھر اس بیکس شہید کا سر زانو پر لئے ہوئے بیٹھی روتی رہی۔ صبح جمنا جی کے اشنان کو لوگ آئے انھوں نے بھی لاش کو دیکھکر پہچانا تمام شہر میں کھلبلی

پڑگئی۔ اس بیکس شہید کی لاش دفن ہوئی۔ شاہ عالم ثانی بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے رام کنور کو بلایا بہت کچھ انعام و اکرام دیا۔ اور اس برہمنی کو اپنی منہ بولی بہن بنا لیا۔ تھوڑے دنوں میں سلونوں کا تہوار آیا۔ بھائی کے لئے بہن موتیوں کی راکھی لیکر پہونچی۔ بادشاہ نے خوشی خوشی راکھی بندھوائی بہن کو جوڑا دیا۔ اس کے رشتہ داروں کو خلعت دئے۔ یہ لیجئے راکھی بندھن کی رسم قلعہ کی رسموں میں شریک ہو گئی جب تک قلعہ آباد رہا۔ اس برہمنی کے خاندان اور قلعہ والوں میں بھائی چارہ رہا۔ ہر سال راکھیاں آئیں۔ بادشاہ اور شاہزادوں کے باندھی جاتیں۔ جوڑے دئے جاتے۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب بادشاہ سے قلعہ چھوٹا۔

پھولوالوں کی سیر بھی اسی محبت باہمی کا نتیجہ تھی۔ ہوا یہ کہ اکبر شاہ ثانی اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ سراج الدین ظفر بڑے بیٹے تھے۔ مگر باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی۔ مرزا جہانگیر کو بادشاہ بہت چاہتے تھے۔ اور کیوں نہ چاہتے۔ مرزا کی والدہ نواب ممتاز محل کا قلعہ میں زور تھا۔ بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم دونوں نے رزیڈنسی میں کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جہانگیر ولیعہد ہو جائیں۔ اس زمانہ میں دلی کے رزیڈنٹ سیٹن صاحب تھے۔ ایسا بادشاہ پرست انگریز شاید ہی ہندوستان میں کوئی آیا ہو تو آیا ہو۔ اکبر شاہ کی وہ ایسی ہی عزت کرتے تھے جیسی خود اپنے بادشاہ کی کرتے تھے۔ ٹوپی اتار کر مجرا گاہ سے ادب بجا لاتے۔ کرسی دیجاتی تو بادشاہ کے سامنے کبھی نہ بیٹھتے۔ گفتگو میں آداب شاہی ملحوظ رکھتے۔ بادشاہ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ غرض سب کچھ کرتے تھے مگر اس پر راضی نہ ہوتے تھے کہ مرزا جہانگیر ولی عہد ہوں۔ بظاہر اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سینہ بہ سینہ تخت نشینی کو درہم برہم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور دوسری یہ تھی کہ وہ مرزا جہانگیر کے عادات و اطوار سے مطمئن نہ تھے۔

مرزا جہانگیر بلا کے پینے والے اور غضب کے منہ پھٹ تھے۔ اس مخالفت سے دلوں میں بیر تو پڑ ہی گیا تھا۔ ایک دن سر دربار مرزا جہانگیر نے سیٹن صاحب کو ٹیلو لو بے بئے کہدیا۔ صاحب کسی نہ کسی طرح پی گئے۔ تھوڑے دنوں بعد یہ غضب کیا کہ ان پر گولی چلائی۔ آخر کہاں تک۔ طرح دیجاتی قید ہو کر الہ آباد گئے۔ ممتاز محل کو بڑا صدمہ ہوا منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئینگے تو حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چادر اور پھولوں کی سہری چڑھاؤں گی۔ خدا کی قدرت اور سیٹن صاحب کی شرافت

دیکھو کرانہی کی سفارش پر صاحب عالم قید سے رہا ہوئے۔ دلی آئے۔ بادشاہ بیگم نے منت بڑھانے کی تیاریاں کیں۔ بڑی دھوم دھام سے چادر گئی۔ شہر بھر کے تمام ہندو مسلمان شریک ہوئے قطب میں کئی دن تک میلہ لگا رہا۔ پھول والوں نے جو سہری بنائی تو اس میں خوبصورتی کے لیئے ایک پھولوں کا پنکھا بھی لٹکا دیا۔ سراج الدین ظفر ولیعہد سلطنت نے "پنکھا" کہکر گذرانا۔

نورِ الطاف و کرم کی ہے یہ سب اسکے جھلک — کہ وہ ظاہر ہے تلک اور ہے باطن میں ملک
اس تماشہ کی نہ کیوں دہوم ہو افلاک تلک — آفتابی سے خجل جسکے ہے خورشید فلک
یہ بنا اس شہ اکبر کی بدولت پنکھا

شائق اس سیر کے سب آج ہیں بادیدۂ دل — واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشم انجم ہو نہ اس سیر پہ کیوں کر مائل — سیر یہ دیکھے ہے وہ بیگم والا منزل
جسکے دیوان کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک — ڈوبے ہیں رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگین ہے رعیت سے لگا شاہ تلک — زعفران زار ہے اک بام سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

بادشاہ کو یہ میلہ بہت پسند آیا۔ دلی والوں سے پوچھا کہ اگر ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے تو کیسا؟ مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑہائیں۔ ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں۔ میلہ کا میلہ ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے۔ بھلا نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دلی والے راضی ہوگئے لیجیئے پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑگئی۔ بادشاہ سلامت خود قطب جاتے۔ وہاں رہتے۔ شہزادی میلہ میں شریک ہوتی۔ بڑھتی بڑھتی یہ میلہ کچھ کا کچھ ہوگیا۔ اسی زمانہ میں گانا چلا۔

قطب کو چلا میرا البیلا — نہ رستہ میں جنگل نہ ملتا ہے ٹیلا

بہادر شاہ کے زمانہ میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس زمانہ میں پھول والوں کی سیر کیسی ہوتی تھی۔ تو ذرا آنکھیں بند کر لیجیئے میں دکھائے دیتا ہوں:۔

لگ گئیں جنگل میں منگل ہو گیا۔ بادشاہ سلامت بھی نکل ثمن[1] برج میں آ بیٹھے۔ شہزادوں کے لئے دیوان خاص کے
صحن میں فرش ہو گیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کے لئے موتی محل۔ خاص محل، ہیرا محل اور اسد برج کی جالیوں کے
سامنے مسندیں بچھ گئیں۔ تیراکوں کے استاد اپنے اپنے شاگردوں کو لے جمنا میں اترے۔ اور تیراکی کے
کمال دکھانے شروع کئے۔ کوئی چت تیرا تو اس طرح گویا تختہ بہا چلا آتا ہے۔ کسی نے کھڑی ماری تو ایسی
کہ گھٹنے تک پانی سے باہر نکل آیا۔ کوئی ہے کہ گٹھری بنا بہاؤ پر چلا جاتا ہے۔ کوئی شیر کے ہاتھ مارتا چڑھاؤ پر
سیدھا چڑھ رہا ہے۔ ادھر تیراکی ہو رہی تھی۔ ادھر قلعہ والوں اور شہر والوں میں کنکوے بازی شروع
ہوئی۔ تکلیں لڑیں تو ایسی کہ چکراتی چکراتی مقبرہ[2] سے آگے نکل گئیں۔ تینگ لڑے تو ایسے کہ سارا آسمان
کنکووں سے چھپ گیا۔ غرض یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو دن پہلے اس شہر میں آفت بپا تھی۔ شام ہوتے
ہوتے میلہ بچھڑنا شروع ہوا۔ رات کے نو دس بجے میلہ بھر وہی جنگل کا جنگل ہو گیا۔ ہاں دونوں اور آبخوروں کے
ڈھیر، پیکوں کے نشان اور چھلکوں کے انبار یہ ضرور بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بڑا شہر تھا جو دم بھر میں بسا
اور دم بھر میں غائب ہو گیا۔

ساون ختم ہوا۔ بھادوں لگا۔ جھڑیوں کا زمانہ گیا۔ پھوار کا زمانہ آیا۔ دلی والوں کے دلوں میں
پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ پھول والوں کی سیر کی سوجھی۔ شرفا دہلی
میں سے دو ہندو اور دو مسلمان لال حویلی[3] پہنچے۔ اطلاع کرائی۔ باریابی ہوئی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد
حرف مطلب زبان پر لائے۔ کہا "پیر و مرشد پھول والوں کی سیر کا زمانہ آگیا ہے۔ جھرنا اور شمسی تالاب بھر کر
کٹورہ ہو گئے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر فرما دی جائے۔ اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب۔" بادشاہ نے
فرمایا "ہاں اماں[4] ٹھیک تو ہے۔ جو تمہاری خوشی۔ وہ ہماری خوشی۔ ۱۵ تاریخ مقرر کر دو۔ رہا ہمارا آنا تو جہاں تم

---

[1] قلعہ میں تسبیح خانہ سے ملا ہوا ایک ہشت پہل برج ہے۔ نام تو اسکا مثمن برج ہے لیکن دلی والے اسکو ثمن برج کہتے ہیں۔

[2] مقبرہ سے مراد ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت دلی سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

[3] دہلی کے قلعہ کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہتے تھے۔ حافظ عبدالرحمن خاں احسان کا شعر ہے:-

میری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں — دہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے۔

[4] آخر زمانہ میں شاہان دہلی انہی معنوں میں "اماں" کا لفظ استعمال کرتے تھے جن میں ہم آجکل "بھئی" کا لفظ بولتے ہیں۔
مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا یہ خیال تھا کہ یہ لفظ شاید "اے میاں" کا مخفف ہے چنانچہ اب بھی دہلی میں اے میاں کو

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

وہاں ہم کیوں نہ آئیں گے۔" تاریخ مقرر ہونا تھا کہ شاہی روشن چوکی کا شہنائی نواز چاندی کی نفیری ہاتھ میں لئے
حاضر ہوا۔ نفیری پر شادیانہ بجایا لیجئے سیر کی ۱۵ تاریخ پکی ہوگئی۔ سارے شہر میں نفیری بجگئی کہ پندرہویں کو
پھول والوں کی سیر ہے۔ لوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔ بادشاہ سلامت دربار خاص سے اٹھ کر
تسبیح خانہ میں گئے ہی تھے کہ تمام بیگمات اور شہزادیاں جمع ہونی شروع ہوئیں۔ ایک آئیں۔ سلام کرکے
بیٹھ جاتیں۔ دوسری آتیں۔ بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی دیر میں سارا قلعہ تسبیح خانہ میں جمع ہوگیا لیکن سب ہیں
کہ منھ سے چپ ہیں۔ مگر نگاہیں صاف کہہ رہی ہیں کہ قطب چلئے۔ بادشاہ سلامت بھی سمجھ گئے۔ فرمایا۔
اُنّاں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ سیر کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ آج دس ہے۔ پندرہ کو سیر ہے۔ اچھا ہوگا
سب سے پہلے ہم چلے چلیں۔ بعد میں گئے تو شہر والوں کو تکلیف ہوگی۔ دو تین دن قطب کا لطف
اٹھالو۔ اور پھر قطب دلّی والوں کے سپرد کردو۔ لوجاؤ چلنے کی تیاری کرو۔ انشاء اللہ کل سویرے
سویرے روانہ ہوں گے۔ اور ہاں میاں[1] دارا۔ تم ہماری سواری کا بندوبست کرو۔ کوتوال سے
کہدو۔ قلعہ دار سے کہدو۔ حکیم[2] صاحب سے میں خود کہدونگا۔ کل صبح سویرے نکل گئے۔ تو سلطان جی
ہوتے ہوئے شام تک انشاء اللہ قطب پہونچ جائیں گے۔" یہ سب لوگ تو اتنا سننے کے لئے جمع ہی
ہوئے تھے۔ ایک ایک اٹھ مجرا کر رخصت ہوا۔ سامان بندھنے لگا۔ سامان بندھتا اور داروغہ
توشکخانہ کے پاس پہونچ جاتا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ بیسیوں پیٹیاں۔ سیکڑوں بوغبندے۔ ہزاروں
لاکھوں پوٹلیاں۔ غرض الم غلم منوں سامان جمع ہوگیا۔ کچھ چھکڑوں میں لادا گیا۔ کچھ اونٹوں پر چڑھایا گیا۔
کچھ شکرموں[3] میں رکھا گیا۔ کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا کہ سامان چلنا شروع ہوا۔ خدا خدا کرکے کہیں

مختصر کرکے امیاں بولا جاتا ہے۔ انکے اس خیال کو پیش نظر رکھکر میں نے دلی کے شہزادوں سے اسکی مکرر تحقیق کی معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت اس
لفظ کو اپنے اصلی یعنی "ہاں" کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کا استعمال حیدرآباد دکن میں اب بھی عام طور سے ہوتا ہے۔

[1] مرزا دارا بخت ولیعہد سلطنت تھے۔

[2] احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں ثابت جنگ بہادر وزیر اعظم تھے۔ انہی کی شہادت سے
بیچارے بادشاہ کو رنگون دکھایا۔

[3] اونٹ گاڑی کو پہلے شکرم کہتے تھے پھر یہ لفظ بند گھوڑا گاڑی کے لئے بھی بولا جانے لگا۔

دو بجے اس لین ڈوری کا تانتا ختم ہوا۔ اسوقت کہیں جا کر بیچارے داروغہ کو دم لینے کی فرصت ملی ابھی پوری طرح دم نہ لیا تھا کہ اردا بیگنی نے حکم پہونچایا کہ حضرت جہاں پناہ کا ارشاد ہوا ہے کہ توشک خانہ شاہی ابھی روانہ ہو۔ جنگلی محل میں قیام ہوگا۔ اسلئے خیموں سراپردوں۔ اور شامیانوں کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں شہر والے اگر یہ سامان طلب کریں تو دیدیا جائے۔ دوسرے حکم کا انتظار نہ کیا جائے۔ اور حکیم صاحب کے ذریعہ سے شہر کے لوگوں کو اس حکم کی اطلاع کرادی جائے۔ حکم پہونچنا تھا کہ داروغہ صاحب پھر کمر باندھ اپنے پیش دستوں کو لے۔ سرکاری سامان باندھنے کی فکر میں لگ گئے۔ یہاں انتظام والے تو اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔ اور وہاں قلعہ والوں کی یہ حالت تھی کہ گویا شادی رچی ہوئی ہے۔ چوڑی والیاں بیٹھی دھانی چوڑیاں پہنا رہی ہیں۔ رنگریزنیں سرخ دوپٹے رنگ رہی ہیں۔ کہیں مہندی پس رہی ہے۔ کہیں کڑاہیاں نکالی جا رہی ہیں۔ کہاں کا کھانا اور کہاں کا سونا۔ اسی گڑبڑ میں رات کے بارہ بجا دیے۔ کوئی دو بجے ہوں گے کہ سواری کا غل ہوا۔ قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے نوبت خانہ سے ملا ہوا جو میدان ہے اس میں سواریاں آلگیں آگئیں۔ مغلانیاں خواصیں[1] چھوکریاں۔ لونڈیاں۔ سریتیں[2] سوار ہونا شروع ہوئیں۔ بہارکسوں۔ منجھولیوں۔ اور بہلیوں میں وہ ٹھسا ٹھس ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ سانگیوں[3] اور ماچیوں[4] میں پہلے تو اٹاٹٹ سامان بھرا۔ اوپر سے بھی دو دو تین تین چھوکریاں اور مامائیں۔ دھنس گئیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی بیل لگائے گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ مشعلچی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھوں میں لے ساتھ ہوئے لوگ قلعہ سے باہر ہی ہوئے ہوں گے کہ بیگمات اور شہزادیوں کے لئے رتھیں۔ ڈولیاں نیمے[5] میانے[6] پالکیاں۔ چوپہلے[7] پینسیں ڈول۔ اور سکھپال ہوتی محل کے برابر آ لگے۔ شاہزادہ ولی عہد بہادر بھی باہر

---

[1] اس زمانہ میں بیگمات اور شہزادیوں کی مصاحبوں کو خواص کہتے تھے۔ درجہ میں یہ مغلانیوں سے کچھ بڑی ہوتی تھیں۔

[2] یہ لونڈیاں سریتیں کہلاتی تھیں۔ سریہ عربی میں لونڈی کو کہتے ہیں۔

[3] و [4] بہارکسوں اور بہلیوں کے سامنے بانس باندھ کر اور رسی کا جال بنا کر جو جگہ نکال لیتے ہیں اسکو سانگی۔ اور اسیطرح پیچھے گھانس وغیرہ بھرنے کو جو جھولی سی بنا لیتے ہیں اسکو ماچی کہتے ہیں۔

[5] [6] اور [7] نیمے بھی پالکی کو کہتے ہیں اسمیں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے اس سے بڑی میانہ ہے۔ چوپہلے بھی پالکی کی وضع کے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی شکل بجائے مستطیل کے چوکور ہوتی ہے۔

نکل آئے۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے راستے بند کئے۔ ترکنوں اور گرجنوں نے قناتیں کھینچیں جو بیگم یا شہزادی باہر آتیں انکو بلحاظ انکے درجہ کی سواری ملتی۔ ہر سواری کے ساتھ ایک قلماقنی اور ایک اردابیگنی مقرر ہو جاتی۔ تین ساڑھے تین بجے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی۔[1] آگے آگے رتھیں۔ اُن کے پیچھے دوسری سواریاں سب سے آخر میں نواب زینت محل کا سکھپال۔ لاہوری دروازہ پر سواری پہونچی تھی کہ کپتان دگلس قلعدار نے اتر کر سلامی دی۔ دروازہ کے باہر سے دگلہ پلٹن کا ایک پرا آگے ہو گیا اور ایک پیچھے شہزادیوں کی سواریوں کے ادھر ادھر قلماقنیاں مردانہ لباس پہنے کھڑکی دار پگڑیاں باندھے۔ ساتوں ہتھیار سجائے ساتھ ہوئیں۔ بیگمات کی سواریوں کو ترکنوں کی پلٹنوں نے بیچ میں لیا۔ انکا بھی مردانہ فوجی لباس۔ گورے گورے چہرے۔ شانوں پر کاکلیں پڑی ہوئیں۔ سر پہ چھوٹا سا عمامہ اس میں سفید پروں کی اونچی کلغی۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں پشت پر ترکش۔ شانہ پر کمان پہلو میں تلوار ڈاب میں پیش قبض بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلی میں گھس آئی ہے۔ نواب زینت محل کی سواری کا بڑا ٹھاٹ تھا۔ آگے آگے دو حبشنیں گھونگھر والے بال۔ ان پر سرخ پگڑیاں۔ پگڑیوں میں سفید پھندنے موٹے موٹے ہونٹ۔ لال لال دیدے۔ سرخ گوٹ کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ۔ گھوڑوں پر سوار۔ ہاتھوں میں پتلی پتلی چوبیں۔ سامنے گھوڑوں کی پشت پر زربفت سے منڈھے ہوئے ڈنکے ایک چوب مارتی۔ دوسری پکارتی "ادب سے نگاہ روبرو حضرت بادشاہ بیگم سلامت" سکھپال کے دونوں طرف دو دو گرجنیں۔ ایک کے ہاتھ میں مورچھل دوسرے کے ہاتھ میں چنور۔ ہر ہر قدم پر بسم اللہ بسم اللہ کہتی چلی آتی تھیں سب سے پیچھے اردابیگنیوں کی پلٹنیں مردانہ لباس پہنے۔ ہتھیار لگائے اونچی اونچی ساتھ ساتھ تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مشعلچنیں کسی کے ہاتھ میں مشعل اور کسی کسی کے ہاتھ میں دوشاخہ کسی کے ہاتھ میں پنج شاخہ۔ سواری کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ یہ جلوس دلی دروازہ تک

---

[1] نواب زینت محل خاندان شاہی سے نہ تھیں۔ نواب علی قلی خاں کے خاندان سے تھیں۔ نواب شمشیر الدولہ کی لڑکی سے بادشاہ نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ خدا کی قدرت سے اولاد ہوئی۔ جوان بخت نام رکھا گیا۔ انہی کی ولی عہدی کے جھگڑوں نے قلعہ میں تفرقہ ڈالا۔ بیگم کی محبت میں بادشاہ ایسے گرفتار تھے کہ جو وہ چاہتیں بلا چون و چرا کرتے۔ آخر انہی کی فتنوں نے دنگوں پہونچا دیا۔ یہ بیگم عجب نفیس تھیں۔ ڈنکا ان کے ساتھ ہوتا اسی لئے ان کو ڈنکے والی کہا جاتا تھا۔ قلعہ میں کم رہتی تھیں۔ لال کنوئیں پر نیا محل بنوا لیا تھا۔ غدر کے بعد وہ محل پٹیالہ والوں کو ملا اب وہ بھی ٹھکانے لگ گیا۔

اسی سلسلہ سے گیا۔ دروازہ کے باہر نکلکر رتھیں تو ترکمان دروازہ کی طرف سے ہوتی ہوئیں قطب کی سڑک پر پڑلیں۔ اور دوسری سواریاں دروازہ کے باہر ہی ٹھیر گئیں۔

کوئی چار بجے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت بیدار ہوئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر گڑ کا[۵۱] شربت پی کر معدہ صاف کیا۔ خانساماں نے یاقوتی کی سربمہر پیالی پیش کی مہر توڑ کر یاقوتی نوش جاں کی اور فرمایا۔ "آں! سب لوگ سدھارے؟" عرض کی "جہاں پناہ کے اقبال سے سب انتظام ہو گیا۔ آیا میر تزک[۵۲] حاضر ہیں۔ کیا ارشاد ہوتا ہے؟" فرمایا۔ "اچھا بسم اللہ کرو"۔ یہ حکم ہوتا تھا کہ بگل ہوا۔ ولی عہد بہادر کے لئے تام جھام۔ مرزا شاہ رخ کے لئے تخت رواں مرزا فخرو کے لئے بوچہ اور خود بادشاہ سلامت کے لئے ہوادار دیوان خاص میں آ گیا۔ باقی سب شاہزادے اور سلاطین زادے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ادھر بادشاہ سلامت نے باہر نکل ہوادار میں قدم رکھا اور ادھر چوبدار نے آواز لگائی "ادب سے تعظیم سے مجرا بجا لاؤ حضرت بادشاہ سلامت"! شہزادوں نے تلواریں میان سے نکال سلامی دی تھی۔ دوسرے لوگ جھک کر آداب بجا لائے۔ بادشاہ سلامت کے بعد ولی عہد بہادر، مرزا شاہ رخ اور مرزا فخرو سوار ہوئے۔ ہوادار کے پیچھے ایک خواصی نے چتر شاہی کھولا۔ دوسرے نے سورج مکھی لی۔ اور یہ جلوس آہستہ آہستہ قلعہ کے دہلی دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ کے باہر پہلے سے فوج کی مثل بندھی ہوئی تھی۔ سب سے آگے نشان کا ہاتھی۔ اس پر شاہی پرچم۔ اس کے پیچھے نقارہ کے اونٹ۔ اونٹوں کے بعد ترک سواروں[۵۳] کا رسالہ۔ رسالہ کے بعد روشن چوکی کے تخت۔ تختوں کے پیچھے میر تزک۔ اس کے بعد سلاطین زادوں کی سواریاں۔ شہزادوں کے گھوڑے۔ مرزا فخرو کا بوچہ مرزا شاہ رخ کا تخت

۵۱۔ بہادر شاہ مرحوم کا دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی گڑ کا شربت پی کر جوں کا توں نکال دیتے تھے۔ اس طرح کل رطوبات فاسدہ خارج ہو کر معدہ صاف ہو جاتا تھا۔

۵۲۔ قلعہ میں میر تزک کا بڑا درجہ تھا۔ دربار و جلوس کا انتظام اور لوگوں کو باریاب کرانے کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ یہ ایک ہی شخص تھے جنکو دربار میں جریب لیکر کھڑے ہونے کی اجازت تھی۔ ذرا کسی نے آداب شاہی میں اونچ نیچ کی اور انہوں نے کھٹ سے جریب پاؤں پر ماری۔ یہ خدمت سعادت یار خاں رنگین کے خاندان میں مدت تک رہی ہے۔

۵۳۔ دلی کی جو فوج انگریزی لباس اور انگریزی ہتھیاروں سے آراستہ تھی اس کو ترک سوار کہتے تھے وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ترکوں کا بھی یہی فوجی لباس تھا۔

تخت رواں۔ مرزا دارا بخت۔ کا تام جھام ان کے پیچھے دوربَاش[1] اور دورباش کے پیچھے بادشاہ سلامت ہوادار۔ ہوادار کے پیچھے فوج کا پرا۔ آخر میں قلعہ کے نوکر چاکر۔ بہیر و بنگاہ۔ سڑک کے کنارے کنارے مشعلچیوں کی قطاریں۔ غرض قلعہ[2] کے دلی دروازہ سے جو مشکل سے ہی تو پرانے کوٹلہ پہ جا کر ختم ہوئی سواری قلعہ کے دروازہ سے نکلی ہی تھی کہ شہدوں نے غل مچایا "حضرت پیر و مرشد۔ ہمارا حق بھی ملجائے۔ خدا تعالی عمر و اقبال میں ترقی کرے۔ آمین۔ اور صد وسی سال یہ سایہ دلی والوں کے سروں پہ قایم رکھے آمین۔ خدا شہزادے شہزادیوں کو سلامت رکھے۔ آمین۔ سیر آرہی ہے۔ کچھ ایسا ملے کہ ہم بھی جہاں پناہ کے صدقہ میں سیر کی بہار دیکھ لیں"۔ بادشاہ سلامت نے اشارہ کیا خواصی نے مٹھیاں بھر بھر کر روپے ہوادار پر سے نچھاور کئے۔ پھر کیا تھا۔ روپیوں کے ساتھ شہدے سڑک پر بچھ گئے کسی نے ہاتھ پھیلائے کسی نے جھولی پھیلائی۔ سواری چلنی مشکل ہو گئی تھوڑی دیر تک یہی ہنگامہ رہا جب دل بھر کر روپیہ لوٹ چکے تو شہدے دعائیں دیتے رخصت ہوئے۔ اور ہوادار آگے بڑھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے خبر ہو گئی تھی کہ آج پچھلی رات کو سواری مبارک قطب جائیگی رات بارہ ہی بجے سے خاص بازار سے لگا فیض بازار اور شہر کے دلی دروازہ تک خلقت کا ہجوم تھا۔ بازاروں میں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ چھتوں اور کمروں پر ہزاروں عورتیں بیٹھی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں ہر شخص اپنے بادشاہ کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ وقت کم تھا۔ اس لئے بازاروں میں آئینہ بندی تو نہیں ہوئی تھی ہاں! بعض بعض مکانوں کے دروازے۔ کمروں کے روکار اور دوکانیں سجا کر روشنی کر دی گئی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ ان سڑکوں پر سے گذرا۔ ایک سناٹے کا عالم تھا۔ مگر ہر شخص کے بشرہ اور آنکھوں سے جوش ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی اس جوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک جھرجھری سی آئی۔ اور آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ آئے کیا خبر تھی کہ نو برس نہ گذریں گے کہ اسی سڑک پر سے گذرنا ہو گا۔ مگر کس حالت میں کہ سڑک ویران ہو گی دلی والے تباہ ہوں گے۔ گولوں کی مار سے مکانات مسمار ہوں گے اور بیگناہوں کے خون سے زمیں رنگیں ہو گی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد اسی سڑک سے پھر شہر میں داخل ہونا ہو گا۔ مگر کس حالت میں کہ خود قید ہوں گے۔ چاروں طرف جنگی پہرہ ہو گا۔ بیٹوں۔ بھائیوں۔ اور بھتیجوں کی لاشیں میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہونگی محل ویران ہوں گے۔ اور محل والیاں خدا جانے کہاں ہو گی اور کس حالت

---

[1] دورباش ایک خوبصورت رنگین شہتیر ہوتا تھا جس پر برچھیاں لگی ہوتی تھیں۔ یہ سواری کے آگے آگے رہتا تھا کہ کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کر بیٹھے۔

[2] قلعہ کے دروازے ہیں۔ لاہوری دروازہ اور دلی دروازہ۔ شہر پناہ کے دروازوں کے بھی یہی نام ہیں۔ لاہوری دروازہ۔ کھاری باؤلی کے [illegible] اور دلی دروازہ موجود ہے۔ فیض بازار کے سرے پر ہے اور اسی میں سے ہو کر پرانے قلعہ کو سڑک گئی ہے۔

میں ہوں گی۔

غرض سواری مبارک ان سڑکوں پر سے گذر کر دلی دروازہ پہونچی۔ محافظوں نے سلامی دی اور جلوس سلطان جی[1] کی سڑک پر پڑ لیا۔ جو زنانہ سواریاں پہلے سے روانہ ہو کر یہاں ٹھیری ہوئی تھیں وہ بھی جلوس کے آخر میں شریک ہو گئیں۔ کہاروں نے یہاں سے قدم ذرا تیز کر دے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے سواری پرانے قلعہ پہونچ گئی۔ شیر شاہ کی مسجد کے سامنے ہوادار رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے مسجد میں نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھا۔ کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کر کے یہاں سے سواری بڑھی۔ ابھی اچھی طرح دن پوری طرح نہ نکلا تھا کہ ہمایوں کے مقبرہ پہونچ گئی۔ مقبرہ میں پردہ ہو گیا۔ سواریاں اتریں باہر دروازے پر بادشاہ سلامت کا ہوادار کہاریوں نے سنبھال لیا۔ اور مقبرہ کے دروازہ پر جا لگایا۔ سامنے کے صحن میں پہلے سے فرش ہو گیا تھا۔ مسند بچھی ہوئی تھی۔ بادشاہ سلامت مسند پر جا بیٹھے وظیفہ ختم کیا۔ مقبرہ کے اندر گئے۔ خاندان شاہی کے سیکڑوں لوگ اس مقبرہ کے تہ خانوں میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہر ایک کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔ شاہزادے ساتھ تھے۔ سب ایک ایک قبر دکھاتے۔ نام بتاتے ان کے کارنامے سناتے اپنی اور ان کی حالت کا مقابلہ کرتے اور بے اختیار رو دیتے۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر پھر ہوادار میں سوار ہوئے۔ اور جس ترتیب سے یہ قافلہ آیا تھا اسی ترتیب سے آگے بڑھا۔ درگاہ شریف قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہونچ گئے۔ دلی والوں کو خاص اس درگاہ سے جو عقیدت ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی کسی قوم اور کسی ملت کا آدمی نہیں جو اس چوکھٹ پر سر نہ جھکاتا ہو۔ اور کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو یہاں سے نامراد جاتا ہو۔ یہ وہ کا انتظام پہلے سے ہو گیا تھا۔ ہوادار باولی پر رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اتر کر وضو کیا۔ شہزادوں نے ہاتھ منھ دھویا۔ شہزادیوں کے لئے باولی کے طاقوں کے سامنے اوٹ لگ گئے تھے۔ کسی نے وضو کیا کسی نے غسل کیا۔ کوئی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ بادشاہ سلامت وضو کر کے ہوادار میں آ بیٹھے۔

---

[1] حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں ان کا مزار مبارک دلی دروازہ سے ۳ میل پر ہمایوں کے مقبرہ کے بالکل سامنے ہے۔

[2] آخر عمر میں بہادر شاہ مرحوم کا دل ایسا رقیق ہو گیا تھا کہ بات بات پر آنسو نکل آتے تھے۔

اردابیگنی نے عرض کی "جہاں پناہ۔ باولی میں تیرنے کے لئے خادموں کے لڑکے آئے ہیں۔ کیا حکم ہوتا ہے"
فرمایا "ہاں۔ اماں۔ ہاں۔ بلاؤ۔ وہ حقدار ہیں۔ اپنا حق لینے آئے ہیں کیوں نہ ملیگا ضرور ملیگا"
حکم ہونا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کے تین بچیس لڑکے اندر آئے مجرا بجا لائے اجازت
چاہی اور گنبد پر چڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر سے بیگمات اور شہزادیوں نے باولی میں روپے پھینکنے
شروع کئے ادھر روپیہ گرا۔ اور ادھر کوئی نہ کوئی لڑکا گنبد پر سے کود اڈبکی لگائی۔ اور روپیہ نکال
لایا۔ تھوڑی دیر تک یہی تماشہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد سب کے سب درگاہ شریف میں گئے۔ پہلے
حضرت امیر خسروؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے حضرت سلطان جی کے مزار پر آئے بادشاہ
سلامت تو اندر چلے گئے۔ عورتوں نے گنبد شریف کے دروازے پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔
کسی نے زنجیر پکڑ کر دعا مانگی۔ کسی نے چوکھٹ کی مٹی لے کر منھ پر ملی کسی نے گود پھیلا کر دل ہی دل میں
دعا مانگی۔ کوئی فاتحہ پڑھ پہلو کی مسجد میں جا نفل پڑھنے کھڑی ہوگئی کسی نے مسجد میں کلام مجید کی
تلاوت شروع کی۔ کسی نے مسجد کے کٹورے کا قصہ شروع کیا۔ کہ دیکھا ہوا یہ کٹورہ سونے کا ہے
بڑا بھاری ہے کئی سیر کا ہوگا۔ یہ سامنے جو تسبیح خانہ ہے۔ اس میں بھی ایک ایسا ہی کٹورہ لٹکا ہوا تھا
دادا جان کے زمانہ میں ایک بڑھیا مصیبت کی ماری درگاہ شریف میں آئی اور عرض کی یا حضرت
سات بیٹیاں ہیں۔ کھانے کو پیسہ پاس نہیں۔ یہ پہاڑ کیونکر اٹھیں گے۔ آپ ہی یہ مشکل آسان کیجئے
وہاں سے اٹھ جو تسبیح خانہ میں آئی۔ تو کٹورہ گنبد سے اتر اس کی گود میں آگیا خوشی خوشی گھر آئی بڑی دھوم
دھام سے بیٹیوں کی شادیاں رچائیں۔ مزے سے ہنسی خوشی رہنے لگی۔ دلی کے ایک امیر تھے ان کو جو
یہ خبر ہوئی تو انہوں نے بھی درگاہ شریف میں جا کر دعا مانگی۔ وہاں سے اس مسجد میں آئے۔ بڑی
دیر تک کٹورے کو دیکھتے رہے۔ کٹورہ جہاں تھا وہیں رہا چل گئے۔ مزدوروں کو بلوا پاڑ باندھی
جتنی پاڑ اونچی ہوتی۔ کٹورہ اور اونچا ہوتا جاتا۔ پاڑ گنبد کی چھت تک پہونچی تو کٹورہ غائب ہوگیا۔
ادھر پاڑ کھلی اور کٹورہ اپنی جگہ پر آموجود ہوا سچ ہے لالچ بری بلا ہے کٹورہ تو کیا ملتا پاڑ باندھنے کا خرچ مفت گلے پڑا
بادشاہ سلامت فاتحہ سے فارغ ہو درگاہ شریف سے باہر آئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے مزار پر مرزا جہانگیر[1]

---

[1] مرزا جہانگیر دلی شہزادے ہیں جنکی وجہ سے پھولوالوں کی سیر قایم ہوئی تھی۔ واپس آنے کے بعد انہوں نے پھر بے اعتدالیاں کیں
(بقیہ بر صفحہ آیندہ)

مرزا نیلی[1] - اور جہاں آرا بیگم[2] - کی قبر پر گئے - فاتحہ پڑھی - یہاں سے پھر باولی پر آئے - خادموں کو انعام دیئے فقیروں کو خیرات تقسیم کی - اور وہاں نے نکل منصور کے مقبرہ کی سیدھی سڑک پر ہو گئے - یہاں دو ڈھائی گھنٹہ آرام کیا - خاصہ تناول فرمایا - کوئی چار بجے یہاں سے روانہ ہو - شام ہوتے ہوتے قطب پہونچ گئے جنگلی محل اور مرزا بابر[3] کی کوٹھی پہلے سے آراستہ تھی جو سواریاں سیدھی قطب آئی تھیں انہوں نے سب سامان قرینہ سے جما دیا تھا - خاصہ تیار تھا - دن بھر کے سب تھکے ماندے تھے - کھا پی - نماز پڑھ - ایسی سوئے کہ جب چار بجے کی نوبت بجی اُس وقت کہیں جاکر آنکھ کھلی -

جنگلی محل اب تو واقعی جنگلی محل ہے - ہاں کسی زمانہ میں بڑا عدار محل تھا - پہلے ہی کچھ کم بڑا نہ تھا - بہادر شاہ نے دیوان خاص - دیوان عام - خاص محل اور باب ظفر بنوا کر اسکو اور بڑا کر دیا - دروازہ کیا ہے - خود ایک چھوٹا سا محل ہے - سرتا پا سنگ سرخ کا ہے - روکار پر سنگ مرمر کی پٹیاں - حاشیہ اور پھول دیکر اس کی رونق کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے - دروازہ کی بلندی کوئی ۱۶، ۱۷ گز ہے پہلو میں ۷، ۷ سیڑھیوں کا چکردار زینہ ہے - محراب کے عین اوپر شاہی بارہ دری ہے - یہیں سے بیٹھ کر بادشاہ سلامت اور بیگمات پنکھوں کا تماشہ دیکھتے تھے - دروازہ سے ملا ہوا درگاہ شریف کا دروازہ ہے - جھرنے سے پنکھے اوٹھ کر اوھر آتے - پہلے دن جوگ مایاجی کا پنکھا اٹھتا - دوسرے دن درگاہ شریف کا - درگاہ شریف کا پنکھا تو برابر والے دروازہ سے مزار شریف پر چلا جاتا - جوگ مایاجی کا پنکھا شاہی دروازہ کے سامنے کچھ دیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پھر الٰہ آباد بھیجدیے گئے - اور وہیں انکا انتقال ہو گیا - نواب ممتاز محل نے انکی لاش الٰہ آباد سے دلی منگوائی اور سلطان جی میں ایک نہایت خوبصورت سنگ مرمر کا مجر بنوا دفن کر دی -

[1] مرزا نیلی شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے تھے - انتقال کے بعد انکو بھی مرزا جہانگیر کے مجر میں دفن کیا گیا -

[2] جہاں آرا بیگم شاہ جہاں بادشاہ غازی کی بیٹی تھیں - حضرت سلطان المشائخ سے بڑی عقیدت تھی - انکا مزار درگاہ کے پائینتی ایک سنگ مرمر کے مجر میں ہے - سرہانے کتبہ لگا ہوا ہے - کتبہ کا یہ شعر بڑا دردناک ہے -

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا | کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

[3] مرزا بابر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے - انکی ایک بڑی کوٹھی انگریزی وضع کی ابتک قطب میں موجود ہے اوسکا ایک دروازہ تو درگاہ شریف میں ہے دوسرا جنگلی محل میں اور تیسرا جنگل میں جھرنے کی طرف نکلتا ہے -

رکتا اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا اندر چلا جاتا۔ باب ظفر کے اندر حصہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بڑے پھاٹک سے لگا کر اندر محل تک سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ ہر ڈیوڑھی پر پہرہ داروں کے لئے سہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ پھاٹک پر تو تلنگہ پلٹن کا پہرہ رہتا۔ اندر کی ڈیوڑھیوں پر ترکنوں[1]۔ قلماقنیوں[2]۔ اردا بیگنیوں[3]۔ سُند نوں[4]۔ اور گرجنوں[5] کی نشست ہوتی۔ بھلا کیا مجال کہ محل میں پرندہ پر تو مار جائے۔ پھاٹک سے گھستے ہی الٹی طرف پہلی ڈیوڑھی کے پاس سے مردانہ کو راستہ جاتا تھا۔ غرض اس محل میں اتنی گنجایش تھی کہ سارا قلعہ اس میں سما جاتا۔ اور پھر بھی جگہ رہتی۔ اب مردانے اور زنانے سب مکانات ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گئے۔ ایک باب ظفر رہ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس محل کا یہ دروازہ ہے وہ محل کیا ہو گا۔ بادشاہ کی کہی ہوئی تاریخ دروازہ کی رو کار پر کندہ ہے۔

این در عالی چو شد مکرم بنا حسب المراد
گفت دل۔ سال بنا۔ باب ظفر پاینده باد

سنہ ۱۱ جلوس ——————— ۱۲۶۴ھ

زمانہ کے ہاتھوں اس دروازہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو اندر کے محلوں کا ہوا۔ وہ تو کہو محکمہ آثار قدیمہ نے اس کو اپنی نگرانی میں لیکر سنبھال لیا ہے۔

خیر۔ تو صبح کی نوبت بجی تھی کہ محل میں چہل پہل شروع ہوئی منہ ہاتھ دھو۔ کپڑے بدل نماز پڑھ ناشتہ کر سب شہزادے شہزادیاں بادشاہ سلامت کے سلام کو آئیں۔ مطلب تھا کہ چلئے۔ یہاں بیٹھنے تھوڑی

---

[1] آخر زمانہ میں ترکستان حبش اور گرجستان سے عورتوں کی آمد بند ہو گئی تھی۔ پہلے سے جو خاندان دلی میں بس گئے تھے انہیں میں سے یہ پلٹنیں بھری جاتیں۔ لباس ان سب کا مردوں کا سا ہوتا تھا یہ سب مردانہ کرتب جانتی تھیں انکا کام محلوں میں پہرہ دینا تھا۔

[2] قلماقنیاں پہرہ دینے اور حکم احکام پہونچانے پر مقرر تھیں انکے لباس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان عورتوں کو شادی کرنا منع تھا۔

[3] اردا بیگنیاں بھی محل کا انتظام کرتیں اور شاہی حکم احکام باہر پہونچاتی تھیں۔ انکا صرف مردانہ لباس ہی ہوتا تھا بلکہ نام بھی مردوں کے سے ہوتے تھے گفتگو بھی مردوں کی طرح تحکمانہ کاٹھی زبانیں کرتی تھیں یعنی تو عورتیں مگر شکل صورت وضع قطع چال ڈھال سے بالکل مرد معلوم ہوتی تھیں انہی کو ترکی ارابیگنیاں کہتے تھے پھر یہ لفظ اردو میں ایسی لڑکیوں کیلئے استعمال ہونے لگا جو بڑی شریر اور دنگئی ہوں اور جن پر سودا کا یہ شعر صادق آتا ہو۔ ؎ لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے نہ کہ نوڈوں میں جا کے ڈنٹر پیلے

آئے ہیں۔ جہاں پناہ بھی وظیفہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ سب کا سلام لیا۔ دعائیں دیں۔ ان سب کا مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا۔ کہو میاں۔ کہاں کا ارادہ ہے۔ جھرنے کا یا قطب صاحب کی لاٹھ کا۔ سب نے عرض کی پیر و مرشد۔ پہلے جھرنے تشریف لے چلئے۔ ابر آیا ہوا ہے۔ اسوقت جھرنے پر بہار ہوگی۔ فوراً اردا بیگنیوں کو پردہ کرانے کا حکم دیا گیا۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے ناکہ بندی کر دی۔ اردا بیگنیوں۔ قلماقنیوں نے راستہ کا انتظام کیا۔ شدنیں اور گرجنیں بیگمات اور شہزادیوں کے ہمراہ ہوئیں۔ ماماؤں۔ اصیلوں خواصوں اور سرتیوں کا غول کا غول نکلا۔ اور سیدھا جھرنے کا رخ کیا۔ شہزادیوں نے پہلے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں سے مرزا بابر کی کوٹھی میں سے ہو کر جنگل میں نکل گئیں۔ پہلے جہاز[1] پر جاکر ذرا دم لیا۔ شمسی تالاب کا لطف اٹھایا۔ میلوں تک پانی ہی پانی تھا۔ برجی[2] بیچ میں آگئی تھی۔ پانی کا یہ عالم دیکھکر سب کے جی میں آیا کہ کود پڑیں۔ پھر خیال آیا کہ بادشاہ سلامت سے اجازت لئے بغیر پانی میں اترنا ٹھیک نہیں چپکی ہو رہیں تھوڑی دیر یہاں ٹھیر کر سب کے سب اولیا مسجد[3] پہونچے مصلوں پر نفل پڑھے اتنے میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی شہزادے ساتھ تھے۔ آگے آگے سواری چلی پیچھے پیچھے عورتوں کا یہ غول روانہ ہوا۔ اولیا مسجد سے جھرنا دور ہی کتنا ہے۔ تھوڑی دیر میں سب کے سب وہاں پہونچ گئے۔

جس نے پہلے زمانہ کا جھرنہ نہیں دیکھا۔ اس نے دلی میں کچھ خاک نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بہشت کا ایک کونہ کاٹ کر مہرولی[4] میں جوڑ دیا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ یہ بنا کس لئے تھا اور ہو کیا گیا۔ فیروز شاہ

۱ے شمسی تالاب کے کنارے جہاز کی شکل کی ایک بہت بڑی اور خوبصورت عمارت قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے اس عمارت کو جہاز کہتے ہیں۔

۲ے اسی تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کھلا ہوا برج ہے اور برج کے نیچے ایک سنگ خارا پر گھوڑے کے سم کا نشان ہے اس سم کے نشان کے متعلق عجیب عجیب روایتیں مشہور ہیں۔ عام طور سے اسکو براق کا سم کہتے ہیں۔ یہ کنارے سے برجی اتنی دور ہے کہ وہاں تک جاتے جاتے اچھے اچھے تیراکوں کے دم ٹوٹ جاتے ہیں۔

۳ے یہ ایک چھوٹی سی مسجد شمسی تالاب کے کنارے پر ہے۔ صحن میں دو مصلے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان مصلوں پر حضرت معین الدین اجمیری اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھا کرتے تھے۔

۴ے مہرولی ہی کو قطب کہتے ہیں یہ دلی سے گیارہ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں یہاں خاصی رونق ہوگئی تھی۔ وہ قطب کے عاشق تھے۔ جہاں ذرا ابر آیا اور انکی سواری قطب چلی۔ کہا کرتے تھے کہ ابر ہمارے قطب جانے کا نقیب ہے۔

تغلق نے شمسی تالاب کا بند باندھکر اسکا پانی نوکھی نالہ میں ڈالا تھا۔ اور اس نالہ کو تغلق آباد کے نالوں سے ملا دیا تھا۔ تاکہ قلعہ میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہو گیا۔ نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر سنہ ۱۷۰۰ء میں نواب[1] غازی الدین فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کے بند کے سامنے حوض بنوائے۔ نہریں نکالیں۔ فوارے لگائے اور اس ٹکڑے کو بہشت کا نمونہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بارہ دریاں۔ دالان اور مکانات بن گئے۔ چار دیواری کھنچ گئی۔ درخت بڑھ کر جھرنے پر چھتر ہو گئے۔ اور تھوڑے دنوں میں یہ جگہ کچھ کی کچھ ہو گئی۔ بند سے سوتوں کی شکل میں پانی جھر جھر کر یہاں آتا تھا۔ اس لئے اس مقام کا نام جھرنا ہو گیا۔ بند سے ملا ہوا جو سہ درہ دالان[2] ہے وہی جھرنے کی جان ہے۔ دالان کی چھت اندر سے کھلی ہے۔ بند کا پانی پہلے چھت میں آتا ہے۔ چھت میں درزیں چھوڑ دی ہیں۔ درزوں میں سے پانی اس طرح گرتا ہے گویا دالان میں مینہ برس رہا ہے۔ دالان کے سامنے کی جو دیوار ہے۔ اس میں چراغ رکھنے کے لئے سیکڑوں طاق بنے ہوئے ہیں۔ چراغوں کے سامنے پانی کی چادر گرتی ہے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یا تو پانی میں آگ لگا دی ہے یا سونا پگھل پگھل کر برس رہا ہے۔ چھت کی منڈیر کے نیچے ۱۲ پرنالے ہیں پرنالوں میں سے ہو کر پانی چھجہ پر آتا ہے۔ چھجہ کے نیچے ایک بڑا حوض ہے۔ پرنالوں کا پانی چھجہ پر پھیل کر اس زور سے حوض میں گرتا ہے گویا دھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔ حوض کے سامنے ۸ گز لمبی ۲ گز چوڑی اور گز بھر گہری ایک نہر ہے۔ حوض کا پانی ابل کر اس نہر میں آتا ہے۔ جہاں نہر ختم ہوئی ہے وہاں سلامی کے پتھر دے کر ایک چادر سی بنا دی ہے۔ اس سلامی کے پتھروں پر ایسی اچھی منبت کاری کی ہے کہ پانی کے بہنے سے چادر پر مچھلیاں سی تڑپتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس چادر کے نیچے شمال اور جنوب سے دو نہروں کے پانی اور آن ملے ہیں۔ آگے چلکر یہ پانی پھر تین نہروں میں بٹ جاتا ہے۔ بڑی نہر تو بارہ دری کے منڈوے[3] کے نیچے سے چلی گئی ہے۔ اور چھوٹی دو دونوں نہریں چکر کھا کر منڈھے کے دونوں طرف سے

---

[1] نواب غازی الدین فیروز جنگ شاہان دھلی کے وزیر نواب آصف جاہ اول کے فرزند تھے۔ یہ وہ غازی الدین فیروز جنگ نہیں ہیں جنہوں نے عالمگیر شاہ ثانی کو کوٹلہ میں شہید کرایا تھا۔

[2] اس بارہ دری کی چھت نہیں ہے۔ بلکہ ٹٹیاں لگا کر پھولوں کی بیلیں چڑھا دی ہیں پھول کھلنے سے ساری چھت ڈھک جاتی ہے۔

چاردیواری کے باہر نکل جاتی ہے۔

محمد شاہ کے زمانہ سے لگا کر بہادر شاہ تک شاید ہی کوئی دلی کا بادشاہ ہوگا جس نے جھرنہ میں کوئی عمارت نہ بنوائی ہو۔

خود محمد شاہ نے تو بڑی نہر کے اوپر بارہ دری کا منڈوا بنوایا۔ شاہ عالم ثانی نے جنوب کی طرف سہ در دالان نکالا۔ اکبر شاہ ثانی نے شمال کی جانب دُہرا دالان تعمیر کیا۔ بیچ میں جو جگہ رہی تھی اس میں بہادر شاہ نے سنگ سرخ کی بارہ دری بنوا کر جھرنہ کی عمارتوں کو مکمل کر دیا۔

جھرنہ کے قریب ہی دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک "پھسلنا پتھر" دوسرے "امریاں"۔

پھسلنا پتھر۔ محمد شاہ بادشاہ کی جدت پسند طبیعت کی یادگار ہے۔ یہ پتھر کوئی سوا چھ گز لمبا اور ۲½ گز چوڑا ہے اور جھرنہ کی مشرقی دیوار سے ملا کر اسکو ذرا جھکا ہوا گاڑ دیا ہے۔ یہ پتھر اس بلا کا چکنا ہے کہ ذرا کوئی بیٹھا اور پھسلا۔ پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا اس پر چڑھنا اور پھسلنا ایک تماشہ ہو جاتا ہے۔ اسی پتھر کے استعارہ سے ذوق نے یہ شعر کہا ہے۔

میں کہاں سنگ دریا ہے ٹل جاؤنگا کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤں گا۔

بارہ دری کے منڈوے سے ملا ہوا جھرنے کا دوسرا دروازہ ہے اور اس کے باہر امریاں۔ آموں کے درخت تو ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے درختوں پر کچھ اور ہی بہار ہے۔ جھرنہ کے پانی سے بارہ مہینے سرسبز رہتے ہیں اور اتنے گھنے ہو گئے ہیں کہ آسمان بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ ادھر انکی سبزی۔ ادھر نیچے گھاس کی سبزی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمیں اور آسمان سبز مخمل کے بن گئے ہیں۔ جھرنے میں چادروں کا گرنا۔ فواروں کا اچھلنا۔ پانی کا بہنا اگر "جنت نگاہ" ہے تو امریوں میں موروں کی جھنگار پپیہے کی پکار۔ اور کوئل کی کوکو "فردوس گوش" ہے۔ غرض جھرنہ ایک عجیب چیز تھا کہ ہر موسم میں نیا لطف دکھاتا تھا اور ہر شخص کو نئی لذت بخشتا تھا۔ اب اسکی بھی بہار گئی۔ شمسی تالاب کٹ چھنٹ کر حوض بنگیا۔ بند اس سے دور جا پڑا۔ پانی کا رسنا موقوف ہوا۔ نہریں خشک ہو گئیں۔ حوض ملبہ سے اٹ گئے۔ درخت سوکھ ساکھ کر کٹ گئے۔ پھسلنا پتھر ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گیا۔ ہاں عمارتیں کھڑی رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں میں ان کا بھی وقت آ لگیگا۔ اسکے بعد جھرنے اور امریوں کا بس نام ہی نام رہ جائیگا۔ سچ ہے :۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

تو ہاں۔ بادشاہ سلامت کے جھرنے پہ پہنچتے ہی قلماقنیوں نے شاہی پنگوڑا کٹہرا کر اس میں مسند بچھا دی ہوادار پنگوڑے کے پاس جا لگا۔ بادشاہ اُتر اس میں جا بیٹھے دو خواصیں مورچھل لے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ دونے آہستہ آہستہ پنگوڑے کو ہلانا شروع کیا تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو اماں۔ کیا ارادہ ہے اب تیر نا ہوتا ہے یا جھولا جھولنا؟"

"اچھا کچھ جھرنہ میں رہو کچھ امریوں میں چلو۔ یہاں کا بھی لطف اٹھاؤ۔ وہاں کا بھی مزا دیکھو لو ہم تو امریوں میں جاتے ہیں"۔ یہ کہہ بادشاہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے بارہ دری کے دروازہ سے امریوں میں آ گئے۔ یہاں پہلے سے انتظام ہو گیا تھا۔ ایک طرف بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم کے تخت بچھ گئے تھے۔ دوسری طرف شہزادیوں کے لئے دری۔ چاندنی۔ اور قالینوں کے فرش کر کے تکیئے لگا دئے گئے تھے۔ درختوں میں بیسوں جھولے پڑ گئے تھے پہلے بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے اس کے بعد سب سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ انتظار تھا کہ کب حکم ہو۔ اور کب جھولوں پر جائیں۔ بادشاہ نے فرمایا "واہ جی۔ واہ خالی جھولا کیسا۔ کڑھائی چڑھاؤ۔ جھولتے جاؤ کھاتے جاؤ"۔ تاج محل[2] نے عرض کی "جہاں پناہ ہم پہلے ہی سے یہ انتظام کر کے آئے ہیں حکم کی دیر ہے ابھی سب کچھ ہوئے جاتا ہے"۔ یہ کہہ لونڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تو حکم کی منتظر ہی کھڑی تھیں ذرا بھی

---

[1] قلعہ میں شہزادے اور شہزادیاں دونوں کو مردانہ فن سکھائے جاتے تھے۔ شاید ہی کوئی ہوگا جسکو تیر چلانا۔ تلوار مارنا۔ بندوق چلانا۔ سوار ہونا اور تیرنا نہ آتا ہو۔ بابر بادشاہ کے زمانہ سے یہ خاندان پانی کا عاشق ہے۔ قلعہ ہی کو دیکھ لو آدھا قلعہ نہروں اور حوضوں نے گھیر لیا ہے۔

[2] نواب تاج محل کا قلعہ میں بڑا زور تھا۔ یہی ڈومنی مگر جب سے بادشاہ نے اس کو محل میں داخل کیا تھا اس وقت سے بادشاہ اس کی مٹھی میں آ گئے تھے۔ بغیر اس کے حکم کے قلعہ میں پتا تک نہیں ہل سکتا تھا۔ آخر نواب زینت محل نے اس کا گھمنڈ توڑا۔ قلعہ سے نکالی گئی۔ اور ایسی نکالی گئی کہ پھر قلعہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

دیر میں بیسیوں کڑھائیاں آگئیں۔ درختوں کی جڑوں میں چولھے لگ گئے۔ کسی کسی بیگم کے سامنے انگیٹھی آگئی
اب ہے کہ کوئی تو میٹھا بیسن پھینٹ رہا ہے۔ کوئی گلگلوں کے آٹے میں کھانڈ ملا رہا ہے کوئی سہال
اور اندرسے تلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ کوئی اندرسہ کی گولیوں کا سامان نکال رہا ہے کوئی چھاج پر
کھجوریں بنا رہا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں خاصہ بازار سا لگ گیا۔ جب سامان سے لیس ہو گئے تو ایک نے
بڑھکر بادشاہ سلامت سے عرض کی کہ حکم ہو تو کڑھائی میں گلگلہ پڑے۔ فرمایا "نہیں اماں! ابھی نہیں
جھولوں پر لوگ بیٹھ لیں اسوقت پکوان شروع ہو۔" یہ کہہ نواب زینت محل اور نواب تاج محل کی طرف
دیکھا۔ وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ تاج محل تو ایسی خوبصورت نہ تھی ہاں زینت محل کی کچھ نہ پوچھو عجیب
قبول صورت پائی تھی۔ شہر بھر میں ایک تھیں۔ انکی جامہ زیبی اور حسن کی تعریف ہی سنکر بادشاہ نے
ان سے شادی کی تھی۔ رنگت ایسی سرخ و سفید تھی جیسے گلاب کی پتی۔ یا شہاب اور سیدہ۔ کتابی چہرہ۔
بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک۔ ہاں بھویں بالکل نہ تھیں۔ اس کمی کو سرمہ کی بھویں بنا کر پورا
کیا جاتا۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ سر پر تاروں بھرا گلنار دوپٹہ۔ جسم پر سرخ انگیا کرتی۔ بادلے کلی کا
سبز زربفت کا پیجامہ۔ موتیوں جڑی ہتھیلی جوتی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا سرمہ۔ دانتوں میں مسی ہونٹوں پر
لاکھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پرستان کی پری امرویوں میں اتر آئی ہے۔ زینت محل نے تاج محل کو ناک بھوں
چڑھا کر دیکھا۔ تاج محل نے زینت محل کو برے برے دیدوں سے گھورا۔ حکم سے لاچار تھیں۔ بادشاہ
سلامت کے سامنے جو جھولا تھا۔ اس کے لال سبز ریشم کے رسے اور گنگا جمنی پٹریاں تھیں دونوں اٹھ اس
میں جا بیٹھیں۔ زینت محل نے پاؤں جوڑے تاج محل نے جھونٹے لینے شروع کئے بادشاہ سلامت نے
فرمایا "واہ جی۔ واہ۔ ایسا سوتا جھولا ہمکو تو پسند نہیں۔ بی ٹرمنھی خانم[1]۔ اور دلدارا[2] کو بلاؤ۔ بھلا بیگمات جھولیں
اور یہ دونوں حجرے میں گھسی رہیں۔" یہ سنتے ہی دو اردا بیگنیاں جا دونوں کو حجرے میں سے پکڑ لائیں۔ دونوں

---

[1] میں نہیں جانتا کہ اس لفظ کی کیا املا ہے ٹرمنھی کے معنی ٹیڑھے منھ والی ہیں۔ لقوے سے اسکا منھ ذرا پھر گیا تھا۔ جو املا میری سمجھ میں آئی وہ میں نے لکھدی۔ جو آپکی سمجھ میں آئے وہ پڑھ لیجئے۔ ٹرمنھی خانم غضب کی گانیوالی تھی۔ تان رس خاں بھی اس سے ذرا کنیاتے تھے آخر اسی سے ڈر کر نکل گئے۔ بادشاہ کی غزلیں حضوری میں یہی گاتی تھی۔ [2] دلدارا اسکی چھوٹی بہن تھی دونوں ڈیرہ دار رنڈیاں تھیں بڑی بہن کی نواسی دو دنی جان اور چھوٹی بہن کی نواسی کالی جان اب تک دلی میں موجود ہیں۔

بیچاریاں جھرنے میں نہا رہی تھیں۔ سارے کپڑے شور بور تھے۔ پہلے تو سامنے آتے ذرا جھجکیں مگر جب بادشاہ سلامت نے خود فرمایا "آؤ۔ اماں آؤ۔ قطب کی بہار یہی ہے" تو اسوقت ذرا ہمت بڑھی۔ کپڑے نچوڑتی ہوئی دونوں جھولے کے ادھر ادھر کھڑی ہوگئیں۔ اور شہزادیاں بھی آواز ملانے آگئیں ادھر انہوں نے ملار شروع کیا۔ ادر ادھر کڑھائی میں گلگلہ پڑا۔ بی منھی خانم اور دلدارا تو خیر رنڈیاں تھیں تاج محل ڈومنی تھیں۔ مگر شہزادیوں کی آوازیں بھی رس میں کچھ ان سے کم نہ تھیں محمد شاہ بادشاہ کے زمانے سے شاید ہی کوئی محل والی ہوگی جو گانا نہ جانتی ہو۔ تان رس خاں اسی لئے نوکر تھے۔ تاج محل اسی سے محل میں آئیں۔ بی منھی خانم اور دلدارا کی اسی گانے سے بادشاہ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ اب جھولے کے ساتھ گانا شروع ہوا۔

جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں   جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

رین اندھیری۔ تال کنارے۔ مرلا جھنگارے۔ بادل کارے۔ بوندیاں پڑیں چھنیاں چھنیاں

جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں

دو سکھی جھولیں۔ دو ہی جھولائیں۔ چار مل گیاں جھول جھلیاں۔ جھولا کن ڈارو رے امریاں

وہ لوز کے گلے۔ وہ رسیلی آوازیں۔ وہ اونچی تانیں۔ وہ وقت کی راگنی وہ سہانا وقت۔ پتے پتے اور ٹہنی ٹہنی سے جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں۔ کی آواز آرہی تھی۔ مور درختوں سے اتر جوش میں آ سامنے ناچنے لگے۔ درختوں کے جانور چہکنے لگے۔ پپیے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کوکو سے سارا جنگل گونج اٹھا غرض ایسا سماں بندھا کہ ایک دفعہ ہی تڑاتڑے سے مینھ کا چھینٹا آیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "واہ۔ اماں۔ واہ قطب میں مینھ سے بھاگتے ہو۔ بھادوں کا چھینٹا ہے۔ ابھی برسا ابھی نکل گیا۔ ہاں بی دلدارا کوئی اور چیز ہوجائے اور ہاں تم سب لوگ ایک ہی جھولے کو کیوں گھیر کھڑے ہو۔ دوسرے جھولوں پر جاؤ۔ گاؤ بجاؤ۔ کھاؤ پیو۔ کچھ لطف اٹھاؤ۔ یہ سننا تھا کہ جھولوں کی طرف سب دوڑ پڑے۔ دو چار جھولوں پر تو بچوں نے قبضہ کرلیا جو باقی رہ گئے ان پر شہزادیاں ہو بیٹھیں جب ذرا یہاں بھیڑ ہوئی تو دلدارا نے دوسری چیز شروع کی۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہوگئے۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہوگئے۔ میں جوگن تیسرے ساتھ۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہوگئے۔

جوگیا بجائے بین۔ بانسری۔ جوگیا بجائے بین بانسری۔ جوگن گائے ہے ملار۔
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگن نے چھایا ہے بدیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے۔ جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے جوگن کے لمبے لمبے کیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

اب کیا پوچھتے ہو۔ گرم گرم پکوان آ رہا ہے۔ کھا رہے ہیں جھولا جھول رہے ہیں۔ کوئی اندرسے کی گولیاں منہ میں دبائے ہے۔ کسی کے منہ میں سہال کا ٹکڑا ہے کسی کے حلق میں بیسن کی پھلکی پھنس گئی ہے۔ سانس رکا جاتا ہے۔ مگر ملار ہے کہ چل رہا ہے۔ مینھ برس کر نکل گیا تھا۔ پھر بھی پانی کی بوندیں درختوں میں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ ادھر بوند کڑاہی میں گری تیل اڑا۔ اور ادھر کسی نہ کسی کے منہ سے "اوئی" کی آواز نکلی کسی کے ہاتھ پر چھینٹا پڑا تو کسی کے منھ پر۔ کوئی تو اوئی توبہ ہے۔ کہہ کر رہ گئی۔ کوئی کلہ سہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسروں نے پھر پکڑ لیا کہ "بیٹھ جاؤ۔ واہ بوا توبج کوئی ایسا نازک بنجائے۔ چھینٹا پڑتا ہی ہے۔ یوں کڑھائی چھوڑ کوئی نہیں اٹھ کھڑا ہوتا"۔ بچوں کے جھولے پر کچھ اور ہی مزا تھا۔ پکوان کی سب سے زیادہ کھپت یہیں تھی۔ دو جھولے تو لڑکوں کے قبضہ میں تھے۔ باقی پر لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ لڑکے تو جھولے میں کھڑے ہو وہ لمبے لمبے پلینگ بڑھا رہے تھے۔ کہ خدا کی پناہ۔ ہاں لڑکیاں جھولوں میں چھوٹی چھوٹی لال سبز پٹریاں ڈالے پاؤں جوڑے جھول رہی تھیں۔ وہ بے سرا ملار چل رہا تھا۔ کہ واہ جی واہ۔ کسی کی تان کدھر جاتی تھی کسی کی کدھر۔ لڑائی بھی ہوتی جاتی تھی۔ کہ "لو بوا۔ بس اترو۔ بہت جھول چکیں اب ہماری باری ہے" لیکن گانے کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا۔ گیت بھی بڑے مزے کا تھا۔ ذرا سنیئے:۔

اماں۔ اڑو جامن نگلے دھرے — اماں میں نہیں کھاتی میری ماں
اماں تتا پانی بھرا دھرا — اماں میں نہیں نہاتی میری ماں
اماں۔ دھانی جوڑا اسلا دھرا — اماں میں نہیں پہنتی میری ماں
اماں۔ بھائی بھاوج ملن کھڑے — اماں میں نہیں ملتی میری ماں

غرض پھوپھا پھوپی سے لگا ماماؤں اور اناؤں تک سب ملنے کو کھڑے ہیں۔ مگر لڑکی کسی سے ملنے کا نام نہیں لیتی۔ آخر تان اس پر ٹوٹی تھی کہ:-

اماں ساجن ڈولا لیے کھڑا   اماں میں نہیں جاتی میری ماں

یہاں تو یہ ہو رہا تھا۔ اور وہاں جھرنہ پر کچھ اور ہی بہار تھی۔ بادشاہ سلامت جھرنہ سے نکل ادھر امریوں میں آئے اور ادھر شاہزادیوں نے کواڑ بند کر، ڈھیلے پائجامے اتار تنگ پائجامے پہن دھم سے جھرنہ میں غوطہ مارا۔ کوئی ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ کوئی تیر رہی ہے۔ کوئی کمر کمر پانی میں کھڑی چھینٹے اڑا رہی ہے۔ بچے اُچھل نہروں میں کھڑے اودھم مچا رہے ہیں کچھ حوض کے سہ درہ دالان میں کھڑی نہا رہی ہیں کچھ پھسلواں پتھر سے پھسل رہی ہیں۔ نیچے گر کر قلا بازیاں کھاتی ہیں۔ کیچڑ میں لت پت ہوتی ہیں۔ حوض میں آ کر کود پڑتی ہیں۔ نہلانے والیاں غل مچاتی ہیں کہ نکلو۔ جی نکلو۔ سارا پانی گدلا کر دیا۔ غرض ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں ایسا مست تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ حضرت جہاں پناہ ناظر کے باغ تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب کیا تھا سب نے پانی میں سے نکل جھٹ پٹ کپڑے بدلے۔ بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نہروں میں سے نکالا۔ یہ ادھر انکے کپڑے لینے گئیں اور وہ دھم سے پھر نہر میں کود گئے۔ بڑی مشکل سے بچوں کو پونچھ پانچھ کپڑے بدلوائے جھرنہ کے دروازے کھل گئے۔ سب کے سب وہاں سے نکل امریوں میں آئے۔ تھوڑا بہت جھولا جھولا پکوان کھایا۔ اور ناظر کے باغ کا راستہ لیا۔

ناظر کا باغ جھرنہ سے قریب ہی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے ناظر روز افزوں نے بنوایا تھا امریوں کے سامنے ہی اس کا بڑا دروازہ ہے دروازہ پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

پئے تاریخ سالش گفت ہاتف   خدایا ئے بود با اللہ مبارک

باغ کے گرد پختہ چار دیواری ہے۔ اندر چاروں طرف سنگ سرخ کی چار بارہ دریاں اور بیچ میں ایک بڑی خوبصورت عالیشان بارہ دری ہے بیچ کی بارہ دری کے چاروں طرف چار حوض ہیں۔ ان حوضوں میں کئی کئی فوارے ہیں۔ جھرنہ کا پانی اس باغ میں آتا ہے ان چاروں حوضوں سے چار نہریں نکالی ہیں۔ تھوڑی دور نہر گئی اور دوسرے حوض میں گر گئی۔ اس سے نکلی تیسرے حوض میں جا گری۔ اسی طرح حوضوں میں سے یہ نہریں ہوتی ہوئی اور سامنے کی بارہ دریوں کے

گرد گھوم کر باہر نکل جاتی ہیں۔ ان نہروں کی وجہ سے باغ کے چار حصے ہوگئے ہیں۔ نہروں کے دونوں کناروں پر چلنے پھرنے کے لئے پختہ روشیں ہیں۔ اس کے بعد گھاس کے تختے۔ ان درختوں سے ملی ہوئی پھولوں کی کیاریاں اور کیاریوں کے بعد گھنے سایہ دار درخت۔ شروع بھادوں تھا آم کے درختوں پر بہار تھی۔ گوندنی کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بھلا بغیر اجازت کسکے کون ہاتھ لگا سکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ سلامت سے اجازت چاہی اجازت ملنی تھی کہ سب کے سب درختوں پر ٹوٹ پڑے۔ آدھے کھائے۔ آدھے پھینکے۔ گٹھلیاں چلیں۔ چھلکے چلے۔ تھوڑی دیر میں نئے کپڑے عجب شان کے ہو گئے۔ بارہ دری کے حوضوں میں پھر سب جاکر نہائے۔ کپڑے بدلے۔ خاصہ پر آکے بیٹھے۔ مگر کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا۔ پکوان اور آموں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ منہ جھوٹا لنے کو بیٹھ گئے تھے ذرا سی دیر میں دستر خوان بڑھ گیا۔ اسکے بعد سب ہیں اور وہی آموں کے درخت۔ شام تک کئی کئی جوڑے بدل سکے گئے۔ غرض کہ سارے کا سارا دن اسی جھرنے۔ امریوں اور باغ کے پھیر میں گذر گیا شام کو جنگلی محل میں آن کر وہ لمبی تانی کہ صبح کی خبر لائے۔

دوسرے دن قطب صاحب کی لاٹھ۔ علائی دروازے[1]۔ امام ضامن کے مقبرے۔ بھیم کی چھٹنکی[2]۔ کڑوے میٹھے نیم[3]۔ اور بارہ بادشاہوں[4] کی قبروں کا چکر رہا۔ تیسرے روز چہل تن چہل منِ[5]۔ بکا ولی کے قلعہ۔ جمالی کمالی کے مزار اور اندھیریا باغ[6] کی سیر کی۔ غرض تین دن میں سارا قطب صاحب تھک کر چور ہو گئے۔ پھرتے پھرتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جب کہیں جاکر قلعہ سے بیٹھے چودھویں تاریخ بھی

---

[1] یہ دروازہ سلطان علاء الدین کا بنوایا ہوا ہے۔ لاٹھ کے بالکل پاس ہے اور خوبصورتی میں لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

[2] مہرولی میں شمال کی طرف کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا پتھر پہاڑ کی چٹان پر رکھا ہوا ہے۔ بچہ بھی ہلائے تو اس طرح ہلتا ہے کہ اب نیچے جا پڑیگا۔

[3] چھٹنکی کے قریب ہی ایک بزرگ کے مزار پر یہ درخت ہے کہتے ہیں رائے پتھورا کی بیٹی انکے ہاتھ پر مسلمان ہوئی تھی اسکی قبر پر بھی اس نیم کا سایہ ہے نیم کے درخت کا جو حصہ ان بزرگ کے مزار پر ہے اسکے پتے میٹھے اور جو حصہ راجہ کی لڑکی کی قبر پر ہے اسکے پتے کڑوے ہیں۔

[4] یہ پٹھان بادشاہوں کی قبریں ایک کھلے چبوترے پر بنی ہوئی ہیں۔

[5] اولیا مسجد کے سامنے چالیس شہیدوں کے مزار ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ کسی طرح گنتی میں نہیں آتے بے ترتیبی کی وجہ سے بھول چوک ہوجاتی ہے۔

[6] چہل تن چہل من کے پاس ہی ایک ویران عمارت ہے سنتے ہیں کہ رات کے وقت اسمیں سے گانے کی آوازیں آتی ہیں۔ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

آگئی تھی۔ صرف جنگلی محل اور مرزا بابر کی کوٹھی قلعہ والوں کے پاس رہی باقی سارے قطب پر دلی والوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

دلی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد اس میں ذرا تیزی آجاتی ہے۔ ادھر تاریخ مقرر ہوئی اور ادھر کارخنداروں (کارخانہ داروں) کے ہاں پتی پڑی جب مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا خرچ ہو گیا۔ اب رہے دوسرے خرچ وہ تم جانو اور تمہارا کام جانے جی چاہے اوٹھاؤ۔ جی چاہے نہ اٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلی خالی ہونی شروع ہوئی۔ اجمیری دروازہ سے لگا۔ قطب تک دو کانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جارہی ہیں۔ رنڈیوں کی رتھیں نکل رہی ہیں۔ ایک ایک رتھ ایسی کہ نظر لگے۔ مخمل کی برجی اس پر زردوزی کے پھول۔ اوپر سنہری کلس اطلس کے پھندنے۔ کلابتوں کی ڈوریاں۔ سفید براق بیلچے اس پر رنگین بیل بوٹے۔ ناگوری بیل۔ ان پر زردوزی کام کی جھولیں۔ گلے میں چاندی کے گھنگرو۔ سینگوں پر سنگوٹیاں۔ ریشم کی ناتھیں۔ اندر بناؤ سنگار کئے۔ رنڈیاں بیٹھی ہیں۔ ایک رتھ آئی نکل گئی۔ دوسری آئی نکل گئی۔ دلی کے شرفا گھوڑوں پر سوار مخمل کے کارچوبی زین پوش۔ لیس ٹکی ہوئی لگا میں۔ گنگا جمنی گہنا پہنے ہوئے گھوڑے رنگی اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور تھامے ہوئے سائیس ان کے صاف شفاف کپڑے چھوٹی چھوٹی سرخ پگڑیاں ایک ہاتھ میں باگ ڈور۔ دوسرے میں چوہڑی۔ سوار ہیں۔ کہ شہسواری کے انداز دکھاتے چلے جارہے ہیں۔ غریبوں کا کچھ عجیب رنگ ہے صرف ایک تہمت[ا] بندھی ہے۔ نہ جسم پر کرتہ ہے۔ نہ سر پر ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں ایک چھوٹا سا دشالہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳)

[۵۷]۔ اندھریا باغ قطب کی جان ہے شمسی تالاب کے جنوبی کنارہ پر اس خوبصورتی سے لگایا ہے کہ دور سے گہرے ابر کا دھوکا ہوتا ہے گھنا ایسا ہے کہ دن کی دھوپ بھی مشکل سے اسکے پتوں میں سے چھنتی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ نے اس باغ میں دنیا کے جو جو مزے اٹھائے ہیں وہ کسی بادشاہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ اب اس سے زیادہ کیا کہوں جو تھا سو تھا ابھی گذر گئے۔ بہادر شاہ کے بیٹے مرزا شاہرخ کا مزار باغ کے بیچ میں ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے۔ اب یہ باغ کسیقدر چھدرا ہو گیا ہے۔

[۵۸]۔ لفظ تو "تہ بند" ہے اس سے تہمد ہوا۔ پھر تہمت بن گیا۔ شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے۔

آبرو کہتے قتل کو حاضر ہوئے کس سے کمر — خون کرنے کو چلے عاشق پہ تہمت باندھ کر

اوندھائے ہوئے سرپٹ اڑے جارہے ہیں۔ اب یہ نہ پوچھو کہ اس مٹکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اسی مٹکے میں ہے۔ تحفہ تحفہ کپڑے ہیں۔ لیس دار کارچوبی ٹوپی ہے۔ لیوان سلیم شاہی جوتی ہے۔ روپے ہیں، پیسے ہیں۔ بچھونا ہے۔ غرض سب ہی کچھ بھرا ہے مٹکے میں اس لئے رکھا ہے کہ بھیگ نہ جائے۔ ترکیب اچھی نکالی ہے۔ سامان کا سامان بچا اور مٹکا قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صبح سے جو یہ لین لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جاکر ختم ہوئی۔ ساری دلی خالی ہو گئی شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں کوئی مرد یا بچہ رہ گیا ہو۔ اب رہی عورتیں تو انھوں نے دلی میں سیر منائی۔ سبزی منڈی نکل گئیں۔ باغوں کی سیر کی جھولے ڈالے۔ کڑھائیاں چڑھائیں۔ آم کھائے۔ حوضوں میں نہائے۔ غرض دل کے پورے ارمان نکال لئے۔ شاہی حکم تھا کہ سرکاری باغ میں دلی والیاں جائیں تو جانے دو۔ پردہ کرادو۔ باہر پہرے لگادو۔ کہ کوئی مرد اندر نہ جاسکے۔ آگے یہ جائیں اور باغ جانے انھوں نے بھی دو روز میں سارے باغوں کو لنڈورا کر دیا۔ آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ دن میں کئی کئی دفعہ اٹھائے جاتے اور پھر وہی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے۔

سیلانیوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لئے کونے تلاش کئے۔ بھلا قطب میں ٹھہرنے کیلئے جگہ کی کیا کمی تھی۔ سرکاری ڈیرے تھے۔ شاہی مکانات تھے۔ مقبرے تھے۔ پرانے کھنڈر تھے۔ اُمرا تو اپنے مکانوں میں جا ٹھہرے۔ روپے پیسے والوں نے سڑک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے وہ کرایہ لے لئے۔ غربا کچھ تو ڈیروں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے۔ کچھ جھرنے میں جا ٹھہرے۔ کچھ ناظر کے باغ میں اتر گئے۔ لیکن جن کو قطب کا لطف اٹھانا تھا انھوں نے آسمان کے نیچے ڈیرا کیا۔ مینہ برستا ہے۔ برسنے دو یہی قطب کی بہار ہے۔

پھر دلی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو۔ اس سرے سے اس سرے تک سارے کا سارا آئینہ بنا تھا دنیا بھر کے سودے والوں کی دوکانیں لگ گئی تھیں۔ میوے مٹھائیوں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا۔ ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں۔ کچوریاں۔ بیوڑیاں۔ سہال اور اندرسے تلے جارہے تھے۔ تو دوسری طرف کبابوں۔ پراٹھوں۔ بریانی۔ زعفران اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار بڑا مہک رہا تھا۔ گاہک ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ لیا کھایا۔ پتے وہیں پھینک آگے بڑھے۔ بنواڑن کی دوکان پر پہنچے۔ بی بنواڑن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے کنگھی کیئے۔ آنکھوں میں سرمہ لگائے۔ دانتوں میں

مسی ملے۔ بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھی پان بنا رہی ہیں۔ دیسی پان لال لال صافیوں میں لپٹے سامنے دھرے ہیں۔ پان بن رہے ہیں۔ مذاق ہو رہا ہے۔ یار لوگوں نے پان لئے خود کھائے دوسروں کو کھلائے۔ پیک تھوکی۔ آگے بڑھے۔ پھول والوں کی دوکان سے گجرے لئے۔ گلے میں ڈالے۔ ساقی کے پاس ٹھہر دو دو دم حقہ کے مارے۔ ایک دو پیسے دئے۔ آگے قدم بڑھایا۔ ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے۔ حقہ کیا ہے۔ ایک تماشہ ہے۔ کوئی گز بھر اونچا نیچہ۔ اس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ یا دو تمباکو آئے لئے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ نَے کو سنبھالنے کے لئے کئی کئی گھوڑیاں دے رکھی ہیں نَے پر خس چڑھا ہے۔ اوپر موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں۔ گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں۔ خود بھی سفید کپڑے پہنے۔ سبز بنارسی سیلہ باندھے۔ لال ٹپکا لپیٹے۔ بھر حقہ پلا رہے ہیں۔ کوٹھے والوں کو پلانا ہوا تو نَے سیدھی کر دی۔ انھوں نے بھی دو کش کھینچ لئے۔ ادھر کسی نے مہنال پر ہونٹ رکھے اور ادھر لوگوں نے شعر پڑھنے شروع کئے۔

حقہ جو ہے حضور معلّٰی کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھرا۔ اتنا بھرا۔ کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تھالی پھینکو تو سروں پر جائے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہی جھرنے سے نفیری کی آواز آئی۔ لیجئے پنکھا اٹھا۔ اب ہر شخص ہے کہ جھرنہ کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں۔ کچھ واپس آرہے ہیں۔ ریلے پر ریلا پڑ رہا ہے۔ جو ذرا دم خم والے ہیں وہ ان جھٹکوں کو سینہ اور پشت پر سہ رہے ہیں۔ جو ذرا کم زور ہیں وہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ۔ ارے بھئی۔ جانے بھی دو۔ کون اس بلا میں پڑے۔ آگے چلکر پنکھا دیکھ لیں گے۔
پنکھا جھرنہ سے اٹھا۔ شمسی تالاب سے ہوتا ہوا۔ مہرولی کی سڑک پر آیا۔ یہاں پہلے ہی سے مشعلیں لال ٹینیں۔ گلاس۔ ہانڈیاں فانوس اور دیوار گیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی ایسی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گذرنا شروع ہوا۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے روپہلی ٹھپہ ٹکے ہوئے سبز کرتے لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں کسی کے گلے میں ڈھول کسی کے گلے میں تاشہ۔ ہاتھوں میں چوبیں دھوں دھوں کرنا اس طرح گزرا کہ سب کے کان گنگ کر دئے ان کے پیچھے دو جھنڈے۔ زربفت کے پھریرے مقیش کے پھندنے۔ کلابتوں کی ڈوریاں۔ جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لال ٹینیں۔ ایک لال ٹین کے سرے پر سنہرا ہلال دوسرے پر

رہی چکر۔ ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا۔ اردلی میں پولیس والوں کا پرا۔ اِن کے پیچھے نوبت خانے کا تخت۔ تخت کیا ہے۔ خاصی بارہ دری ہے۔ تخت کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر اوپر کھپچیوں کا نصف گنبد بنا۔ کپڑا منڈھ۔ پنی لگا۔ کاغذوں کے پھولوں سے سجا۔ دروں میں گیندئی پردے ڈال ڈوریوں سے کس دیئے۔ نوبت والے اندر جا بیٹھے تخت کو کہاروں نے اٹھایا اور یہ خاصہ مکان کا مکان جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانے کے پیچھے دلی کے اکھاڑے۔ ہر اکھاڑہ کے ساتھ ایک ایک استاد بیس بیس پچیس پچیس شاگرد۔ بنے ہوئے تیار جسم۔ چوڑے چوڑے سینے بھرے بھرے ڈنٹر پھری ہوئی مچھلیاں پتلی پتلی کمریں جسم پر چست جانگئے گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ۔ کوئی بنیٹی کا چکر باندھ رہا ہے۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے کہیں پھری گتکہ سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے ان کے پیچھے نفیری والے اور ان کے ساتھ دلی کے سقے۔ سفید براق کپڑے پہنے لال کھاروے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے۔ سبز پٹکے سروں پر باندھے۔ ہاتھوں میں منجھے منجھائے پیتل کے کٹورے لئے۔ نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملا۔ تے چلے آ رہے تھے۔ نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں۔ ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے پندرہ بیس کا حلقہ۔ بیچ میں طبلہ سارنگی والے۔ تال سُر پہ ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ عجب مزا دے رہی تھی۔ اِن کے پیچھے تخت رواں۔ تختوں پر رنڈیاں بھاری بھاری پشوازیں پہنے۔ کارچوبی ڈوپٹے اوڑھے۔ پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ اِن کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا رسالہ۔ سُرخ بانات کی وردیاں۔ انہیں سفید بانات کے کف اور کالر۔ شانوں پر فولادی جال۔ پاؤں میں کالی برجسیں۔ لک[1] کے چمڑے کے اونچے بوٹ۔ سر پر سرخ منڈاسے۔ ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے لئے گھوڑوں کے کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی اور سیلانیوں کا اژدہام۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے کارچوبی ٹوپیاں۔ ململ کے ٹکے ہوئے نیچے چولی کے انگرکھے ایک برے پاجامے۔ سلیم شاہی جوتیاں ان بعض کچھیر[2] پلٹن کی چادر و ملاہیں۔ کم عمر گورے گورے لڑکے سر پہ دھانی منڈاسے۔ منڈاسوں پہ چھوٹی

---

[1] Patent Leather کو دلی میں لک کہتے ہیں۔

[2] شہر فا دلی کے لڑکوں اور کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی۔ چھوٹے لڑکے گر غدر میں باؤ ٹے کے نیچے

(باقی بر صفحہ آئندہ)

چھوٹی کلغیاں، سبز[1] اطلس کے کوٹ، سفید اطلس کی کسی ہوئی برجیس، سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے۔ ہاتھوں میں سبز پھریروں کے چھوٹے چھوٹے نیزے۔ بڑی آن بان سے قدم ملاتے چل رہے ہیں۔ ان کے پیچھے دلی کے شرفا اور عمائد کا ہجوم۔ نیچی نیچی قبائیں اور چغے۔ ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی گیندنما پگڑیاں، مسلمانوں کے سروں پر زعفرانی عمامے اور چوگوشیہ ٹوپیاں۔ ہاتھوں میں رنگ برنگ کی چھڑیاں۔ ہشاش بشاش چہرے، گلے میں پھولوں کے کنٹھے۔ ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں۔ موسم کا لطف اٹھاتے میلہ کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں۔ ان کے بعد شاہی شہنائی نواز و نکا گروہ۔ نفیری کے کمال دکھاتا۔ موسم کی چیزیں بجاتا۔ خود بھی اپنے کمال کے مزے اٹھاتا۔ پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے۔ سب سے آخر میں پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والوں کا غول۔

بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا، پنی چڑھا، آئینے لگا، پھولوں سے سجا۔ ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش محبت اور یگانگت کا نشان تھا جس نے چھوٹے۔ بڑوں۔ ہندو، مسلمانوں۔ غربا۔ امرا۔ غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا۔ اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا ان کے پروانے۔

غرض خلقت کا یہ ہجوم پھوار میں چمکتا، خس کے پنکھے جھلتا آہستہ آہستہ مہرولی کی سڑک پر سے گزرا۔ باجہ والے اور نفیری والے ہر گھر کے سامنے ٹھیرتے۔ ایک آدھ چیز سناتے۔ انعام لیتے اور آگے بڑھتے۔ ہوتے ہوتے یہ جلوس شاہی دروازہ کے سامنے پہنچ گیا۔ بادشاہ سلامت بارہ دری میں برآمد ہوئے۔ بیگمات کے لئے چلمنیں پڑ گئیں اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آگئی۔ پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا۔ یہاں باجہ والوں نے اپنے کمال

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سب کٹ کر ڈھیر ہو گئے ان کے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے خدا معلوم کیا بات ہے۔ ہاری ہوئی فوج تھی شاید اسلئے ان کا ذکر بے ضرور سمجھا گیا۔

[1] دہلی کا شاہی رنگ سبز تھا۔

دکھائے۔ اکھاڑے والوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ سقوں نے کٹورے بجائے ڈنڈے والوں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ رنڈیوں نے اپنا ناچ دکھایا۔ سب کو حسب مراتب انعام ملا۔ کسی کو سیلہ ملا۔ کسی کو دوشالہ ملا۔ کسی کو منڈیل ملی کسی کو کڑے ملے۔ اتنے میں پنکھا بھی سامنے آگیا۔ شہر کے شرفا و امراء مجرا بجا لائے اوپر سے سارے مجمع پر گلاب پاشوں سے گلاب اور کیوڑہ چھڑکا گیا عطر اور پان سے تواضع کی گئی۔ بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولیعہد بہادر نیچے اتر آئے۔ لوگوں کے گلے میں پھولوں کے کنٹھے ڈالکر سب کو رخصت کیا۔ یہاں سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہو گئے۔ کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ پنکھا جوگ مایاجی پہنچ گیا۔

یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر ہے۔ بڑی لمبی چار دیواری ہے۔ کونوں پر برجیاں ہیں احاطہ کے اندر (۲۰-۲۲) عمارتیں اور بیچ میں دیوی کا استھان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوی کرشن جی کی بہن تھیں بجلی بنکر الوپ ہو گئیں۔ اور یہاں آن پڑیں۔ راجہ یدھشٹر نے مندر بنوادیا مندر زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ پھول والوں کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایما سے لالہ سیدھ مل نے نیا مندر بنوایا۔ رفتہ رفتہ اور عمارتیں بھی اندر بن گئیں۔ اب یہ خاصی آباد جگہ ہو گئی ہے۔ اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے اندر پلنگ یا چارپائی نہیں جا سکتی۔

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوئے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ باب ظفر کے سامنے آکر ٹھہرا۔ بعض مصاحبوں نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف میں کسی نہ کسی طرح لے چلیں۔ مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے کہا۔ آہاں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب میں جوگ مایاجی کے پنکھے کے ساتھ نہیں گیا۔ تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں۔ ہمارے ہندو بھائی کیا خیال کرینگے کہیں گے مسلمان تھا مسلمانوں کے پنکھے میں شریک ہو گیا ہمکو غیر سمجھا۔ اسلئے جھروکوں سے پیچھے بھی نہیں آیا۔ نا۔ اماں۔ نا۔ جیسا ایک کے ساتھ کرنا ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے۔ اب بھی جائیں گے۔ آتشبازی[1] میں ہندو مسلمان سب شریک

---

[1] میرے بزرگوں کی زبانی سنا تھا کہ بادشاہ کو آتشبازی کا بڑا شوق تھا۔ آتشباز نوکر تھے۔ کوئی میلہ نہ تھا جسمیں قلعہ سے آتشبازی نہ جاتی ہو دہلی والوں سے مقابلہ ہوتے تھے ان مقابلوں کے دو بڑے میدان تھے ایک شمسی تالاب۔ دوسرے سید حسن رسول نما کا

पुस्तकालय
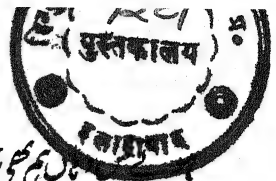
...ہاں ہم بھی چلیں گے۔"

خیر۔ درگاہ شریف[1] تو قریب ہی تھی۔ لوگ دس بجے پنکھا چڑھا کر فارغ ہو گئے اور یہاں سے نکل سیدھے شمسی تالاب پہونچے۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ بیگمات کے لئے جا بجا چلمنیں پڑ گئیں وہ اندر جا بیٹھیں۔ بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جلوس کیا۔ مصاحبوں اور دہلی کے اکثر امرا و شرفا کو اوپر بلا لیا گیا۔ سارے سیلانی تالاب کے کنارے جم گئے۔ تالاب میں سینکڑوں کشتیاں بجرے اور نواڑے پہلے ہی سے پڑ گئے تھے۔ آدھوں میں شاہی آتشباز سوار ہو کر ایک طرف چلے گئے۔ باقی میں دہلی کے آتشباز اور شوقین بیٹھ کر دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا کہ دونوں پارٹیاں مقابلے پر تیار ہو گئیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حوض پھولوالوں کی سیر میں تو اب آتشبازی نہیں چھٹتی۔ ہاں سید حسن رسول نما میں اب بھی خوب مقابلے ہوتے ہیں۔ ان بزرگوں کے بیان کی تائید اب ایک کتاب سے بھی ہو گئی۔ ابھی حال میں مسٹر اینڈروز نے شمس العلما منشی ذکاء اللہ خاں دہلوی کی سوانح عمری لکھی ہے اور دہلی کے بڈھوں بڈھیوں سے پوچھ پوچھ کر غدر سے پہلے کے حالات جمع کئے ہیں۔ اس میں بادشاہ کے اس شوق کا بھی ذکر ہے۔ اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور دہلی والوں میں کیا تعلقات تھے اور کس طرح یہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے جس بڈھے سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ ہندو ہو یا مسلمان اسکے آنسو نکل آئے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا قصہ بیان کر رہا ہے بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی ۱۹۲۹ء میں ڈبلیو ہیفر اینڈ سنز لمیٹیڈ کیمبرج نے چھاپی ہے اور ساڑھے سات روپے قیمت ہے۔

[1] یہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی ہے۔ آپ حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی رح کے خلیفہ تھے۔ سلطان شمس الدین التمش کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپکا وصال قوالی میں اس شعر پر ہوا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ÷ ہر زمان از غیب جانے دیگر است۔

دہلی کے بادشاہوں نے آپکے مزار کے گرد سنگ مرمر کی [illegible] لگایا فرش اور دروازے بنوائے دیواروں پر کاشانی اینٹوں کا کام کرایا اور آس پاس مسجدیں اور حجرے تعمیر کرلئے۔ خود مزار شریف تو کچی مٹی کا ہے۔ ہاں آس پاس دوسروں کی قبروں کے بڑے عمدہ عمدہ سنگ مرمر کے تعویذ ہیں ایک طرف سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد ہے اور اسکے پہلو میں آخری بادشاہان دہلی کے مزار۔ بیچ میں شاہ عالم ثانی کا مزار ہے اور اسکے ایک طرف اکبر شاہ ثانی کی قبر۔ ایک پہلو خالی تھا اسمیں بہادر شاہ نے اپنا سردابہ بنوایا تھا۔ خیال تھا کہ مرنے کے بعد باپ دادا کے پہلو میں جا پڑیں گے یہ کیا معلوم تھا کہ وہاں قبر بنے گی۔ جہاں بزرگوں کا پہلو تو کجا کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھٹی۔ مہتابی چھٹنا تھا کہ میدان کارزار گرم ہوگیا۔ سب سے
پہلے غبارے چھوڑے گئے۔ اور ذرا سی دیر میں آسمان پر ہزاروں چاند اور سورج نکل آئے۔ ان سے
فراغت ہوئی تو جنگی آتشبازی[1] کا نمبر آیا۔ ہوائیاں[2] چھلکے[3]۔ لٹو[4]۔ اور کھنگے[5] چلے۔ ہوائیوں کی شائیں شائیں۔
چھلکوں کی غائیں۔ غائیں۔ لٹوں کی دہائیں۔ دہائیں۔ کھنگوں کی زائیں۔ زائیں۔ اور قلموں[6] کی سائیں سائیں
سے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہو رہی ہے۔ ادھر آسمان پر مقابلہ ہو رہا تھا اور ادھر پانی پر
آتشبازی کے بجرے چھوٹے۔ بجرے کیا تھے۔ چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ توپوں کی جگہ مہتابیاں
اور چھچھوندریں۔ گولوں کی جگہ چکر اور کھنگے مستولوں کی جگہ انار۔ آدمیوں کی جگہ مٹی کے سپاہی پیٹ
میں بارود۔ ناف میں چھچھوندر۔ اس سرے سے اس سرے تک مشتابہ کا سلسلہ۔ ادھر سے دلی والوں کے
بجرے چلے۔ ادھر سے قلعہ والوں کے بجرے آئے۔ بیچ تالاب میں پہنچ کر دھواں دھوں ہونے
لگی۔ سمندر کی لڑائی کا مزا آگیا۔ آتشبازی کی چمک سے سارا تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے
اور پانی میں روشنی کے عکس۔ کشتیوں کے سائے آتشبازوں کے ننگے ننگے جسم۔ کناروں پر خلقت کے
ہجوم ان کے غل۔ آتشبازی کے عکس سے انکے زرد زرد چہروں۔ اور اوپر دھوئیں کے بادلوں نے

۱۔ دہلی والوں نے آتشبازی کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک جنگی۔ دوسرے گلکاری۔ ان دونوں کا مطلب آگے خود آپ سمجھ جائیں گے۔

۲۔ بڑے اڑن اناروں کو دہلی میں ہوائی کہتے ہیں۔

۳۔ موٹے مضبوط بانسوں کی لمبی لمبی پوریوں پر آنتیں لپیٹ اوپر سے جھلی چڑھا اور اندر خوب ٹھونس ٹھونس کے بارود بھر کر چھلکا بنایا جاتا ہے اسکا چلانا واقعی بڑا کمال ہے۔ بارود کو آگ دے اسکو ہلانا شروع کیا جب زور پکڑ گیا تو جھلا کر اور کبھی چکر دیکر اوپر چھوڑ دیا اب بانس کی یہ آدھ گز لمبی پوری غائیں غائیں کرتی اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر چھوڑنے میں کہیں ہاتھ بیچارہ گیا اور یہ پوری تماشائیوں میں گھس گئی تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا منہ جھلس گیا کسی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی غرض یہ آتشبازی کیا ہے ایک بلا ہے۔

۴۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے گولے بناتے ہیں یہ اندر سے خالی ہوتے ہیں ایک طرف چھید کیا اور بارود بھر دی چھید میں چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی۔ چلاتے وقت چھچھوندر کو آگ لگا۔ لٹو کو اوپر پھینکا۔ اندر کی بارود نے آگ لی۔ اور لٹو پھٹا۔ اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے توپ چل گئی ۵۔ خدنگ کو دہلی والے کھنگ کہتے ہیں۔ یہ چیز ایسی عام ہے کہ کسی نوٹ کی ضرورت نہیں ۶۔ بڑی چھچھوندر کو قلم کہتے ہیں۔ اسکی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر لوٹنا جانتی ہی نہیں۔ پانی کی چوٹ کھا کر بھی اٹھتی ہے تو پچیس تیس گز اونچی اڑ جاتی ہے۔

ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی ہتابیوں، آفتابیوں، اناروں، بھروں، جائی جوئیوں، بیت پھولوں اور چرخیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونوں طرف کی کشتیاں سمٹ کر جہاز کے بالکل سامنے آگئیں۔ یہاں استادوں نے اپنے ہنر کے کمال دکھائے۔ نسری چھوڑی تو ایسی کہ لوٹ کر سو سو دفعہ اٹھے اور رہ رہ کر سانس لئے۔ بتاشہ انار ایسے کہ کئی کئی گز اونچے جائیں۔ اور بیچ رنگی پھول دیں۔ اور پھر یہ مزا کہ ہتیلی پر چھوڑ لو کیا مجال جو جیرک لگے۔ بڑے انار جو اٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سرو کے درختوں کو آگ لگا کر کشتیوں میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان سے رنگ برنگی پھول جھڑ رہے ہیں۔ دم اتنا کہ ختم ہونا ہی نہ جانیں کمال یہ ہے کہ پٹے پر دھبہ نہ دیں۔ آتشبازی کی روشنی سے تو یہ نظر آتا تھا کہ سارے کا سارا پانی سونے کا ہو گیا ہے اور اس کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تالاب میں آتشیں باغ لگا دیا ہے۔

غرض دو بجے کے قریب آتشبازی ختم ہوئی۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے شال، دوشالے، منڈیلیں اور سیلے تقسیم ہوئے۔ کہیں تین بجے جا کر لوگوں کو فرصت ہوئی۔ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا پڑے۔ بادشاہ سلامت کی سواری رات ہی کو قطب سے نکل گئی۔ اور روشن چراغ دہلی ہوتی ہوئی[1] تیسرے پہر تک دہلی آگئی۔ دوسرے روز لوگوں نے صبح ہی صبح اٹھ میوے، مٹھائیاں، پرا ٹھے پھلے[2] اور کھلونے خریدے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نکل اپنے گھروں کا راستہ لیا۔ شام تک مہرولی سنسان اور دہلی آباد ہو گئی۔

دیکھ لیا آپ نے پھول والوں کی سیر کا مزا۔ اور اب کی کیا پوچھتے ہو۔ غدر ہوا۔ دہلی تباہ ہوئی۔

---

[1] حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پرانی دہلی میں ہے۔ قطب سے ۵ میل اور دہلی سے کوئی ۶ میل۔ آپ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ ہیں اور ان میں سے آپکو چراغ دہلی کا خطاب ملا تھا جہاں آپ کا مزار ہے اس بستی کو اسی خطاب کی وجہ سے چراغ دہلی یا روشن چراغ دہلی کہنے لگے ہیں۔

[2] یہ چیج پھول والوں کی سیر کی بس دو ہی سوغاتیں تھیں۔ ایک پراٹھے۔ دوسرے پھلے۔ جو استے اور مشہور تھے۔

دشاہ رنگوں پہو پنچے۔ بندھن ٹوٹ گیا تیلیاں بکھر گئیں۔ بندھن اب بھی ہے۔ مگر وہ محبت کا بندھن تھا
قانون کا بندھن ہے۔ ذرا کچھ بات ہوئی اور چل بھیا۔ عدالت میں بات یہ ہے کہ پھول والوں کی
سیر رعایا کی عقیدت اور بادشاہ کی محبت کا مظاہرہ تھی۔ بادشاہ کے بعد بھی چلی۔ مگر مرکز اور
بلنے جھتی نہ ہونے سے زور گھٹتا گیا۔ اب پانچ چھ برس سے بالکل بند ہے۔ اگر یہی تیل و نہار ہیا
دردلوں کی کدورت کا یہی حال رہا۔ تو ہمیشہ کے لئے اس کو بند ہی سمجھو۔

اے ہم نشین میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

مضمون ختم ہوگیا۔ پڑھنے کے بعد ہر شخص کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ یہ واقعات ہیں یا کوئی
من گھڑت قصہ۔ اسکے متعلق میں بعض باتوں کی وضاحت کردینا مناسب سمجھتا ہوں اس مضمون میں
جس قدر تاریخی واقعات یا مکانات کے نقشے ہیں۔ ان کی صحت میں تو کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا
البتہ بقیہ واقعات کے متعلق دل میں دگدا پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کی یہ کیفیت ہے کہ جھرنے اور
امریوں کے واقعات کا حال میں نے ان بڑھیوں سے سنا ہے جو ان جلسوں میں شریک تھیں۔ اس
زمانہ کی سیر دیکھنے والے اب بھی دہلی میں موجود ہیں وہ میرے ایک ایک حرف کی تائید کریں گے
جلوس کی تصویر خود میں نے اپنے مصوری کے استاد کے ہاں دیکھی ہے۔ میں نے صرف یہ کیا ہے
کہ ان واقعات کو ملا کر رنگ بھر دیا ہے۔ اب رہی گفتگو تو وہ البتہ میرے خیال کا نتیجہ ہے لیکن جو
تعلقات اور محبت رعایا اور بادشاہ میں تھی اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس گفتگو کو بھی مبالغہ آمیز
نہیں کہا جاسکتا مسٹر سی۔ ایف اینڈ روز کی کتاب "ذکاء اللہ دہلوی" اٹھا کر دیکھ لو معلوم ہو جائیگا
کہ جو کچھ میں نے اس بارے میں لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ مسٹر اینڈ روز میرے استاد تھے مجھکو معلوم ہے
کہ کس طرح بڈھے بڈھوں سے ملکر انھوں نے غدر سے پہلے کے حالات دریافت کئے ہیں اور خود ان پر
اس تعلقات کا کیا اثر ہوا ہے۔

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۲۶۱ھ کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ اسکی بھی ایک
خاص وجہ ہے ۱۲۶۱ھ تک بہادر شاہ کی زندگی بہت چین چان اور امن و امان سے گزری۔
اس سال کے بعد ہی سے اس بیچارے پر پے درپے مصیبتیں آنی شروع ہوئیں۔ دارا بخت

ولیعہد کا انتقال ہوا۔ مرزا شاہرخ مرے۔ مرزا فخرو چل بسے۔ خود بادشاہ کو زہر دیا گیا۔ جواں بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے۔ قصہ مختصر یہ کہ غدر تک ان مصیبتوں نے بچارے بڈھے بادشاہ کو بٹھا دیا۔ اسی خیال سے میں نے وہ آخری سال لیا ہے جب بادشاہ ان تمام فکروں اور مصیبتوں سے آزاد تھے۔

بہرحال یہ بڈھوں کی ودیعت تھی جو میں نے آپکو پہنچا دی اب چاہیں آپ اسکو قبول کریں یا نہ کریں۔

بڑا مزا اُس ملاپ میں ہی جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

بات یہ ہے کہ دونوں غلطی پر تھے۔ بیوی سمجھتی تھیں کہ جوانی میں محبت کے جو اقرار مدار میاں نے کئے تھے وہ شادی کے دس برس بعد بھی بحال خود قایم ہیں۔ میاں سمجھتے تھے کہ باوجود چار بچے ہو جانیکے بیوی اسی طرح میری خوشی کو مقدم سمجھتی ہیں۔ جیسے بچے ہونے سے پہلے سمجھتی تھیں۔ بیوی جوانی کی امنگ کو محبت سمجھے ہوئے تھیں۔ میاں نکاح کو بیوی کی تحریر غلامی خیال کرتے تھے۔ میاں سمجھتے تھے جو کمائے وہ گھر کا مالک بیوی سمجھتی تھیں جو اٹھائے وہ گھر کا مالک۔ میاں تعلقات دنیوی کو محبت سے تعبیر کرکے چلتے تھے کہ بیوی دین دنیا سب کچھ چھوڑ کر بس میری ہو رہیں۔ بیوی سمجھتی تھیں کہ یہ تعلقات صرف عارضی محبت ہیں اصلی محبت وہ ہے جو ماں کو بچوں سے ہوتی ہے۔

غرض بات یہ ہے کہ دونوں غلطی پر تھے۔

پہلے چھوٹی چھوٹی باتوں پر چلی اور تھم گئی۔ خود دیر سے اُٹھے۔ کچہری وقت پر نہ پہنچے۔ الزام بیوی کو دیا گیا۔ کہ وقت پر ناشتہ نہیں ملا۔ یا گھوڑی کو دانہ دیر میں دیا گیا۔ دفتر گئے۔ واپس آتے آتے گئی گزری بات ہو گئی۔ باہر دوست یار دفتر والے ملنے آئے۔ منگانے پر پان نہ آئے۔ شرمندگی ہوئی خود اندر جا کر غل مچایا۔ بیوی نے کہا کیا کروں۔ انا ایسی غائب ہوئی ہے کہ آنے کا نام نہیں لیتی۔ بچہ رو رہا تھا۔ اسلئے پان نہ بنا سکی۔ اب بنا کے بھیجے دیتی ہوں۔ یہ باہر آئے۔ تھوڑی دیر میں پان آ گئے یاروں کی باتوں میں دل بہل گیا۔ دوبارہ پھر خاصدان بھرا آ گیا خوش ہو گئے معاملہ رفع دفع ہوا۔ یہ اندر بیٹھے لکھ رہے تھے۔ کسی کام کو اٹھے۔ بڑے لڑکے نے سیاہی کا غذوں پر اوندھا دی۔ دیکھا تو ساری

ی کرائی محنت خاک میں مل گئی۔ چیختے چلاتے اُٹھے۔ لونڈا سمجھ گیا کہ رخ میری طرف ہے۔ بھاگا۔ وہ آگے اور یہ پیچھے۔ کیاری کے دو چار چکر کاٹ آخر جالیا۔ اور کان پکڑ کر دو ہاتھ مار ہی دیئے۔ لونڈا وہ فیل لایا کہ خدا کی پناہ۔ چیخیں مار مار سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ بیوی باورچی خانہ سے بڑبڑاتی ہوئی نکلیں۔ بچے کو اٹھا لیا۔ پیار کیا۔ کچھ نیچی آواز میں میاں کو بھی کہہ گئیں۔ سارے دن غصہ رہا۔ شام کو تنخواہ آگئی۔ میاں بیوی حساب کرنے بیٹھے صبح کی مار کا بھی کچھ ذکر آیا۔ مگر روپیوں کی آواز میں دب کر رہ گیا۔ چلو صفائی ہو گئی

کچھ دنوں یونہی چلی۔ اسکے بعد پہلے جن چیزوں پر نظر بھی نہیں پڑتی تھی۔ وہ بنائے فساد ہو گئیں۔ دفتر کو دیر ہو رہی تھی۔ بیوی بچے میں لگی تھیں۔ میاں نے باورچی خانہ میں جاکر تقاضہ کیا۔ باہر نکلے تو بیوی سر ہو گئیں "تم باورچی خانہ میں کیوں گئے۔ مجھ سے کہا ہوتا۔ آخر میں مر گئی تھی۔ اسی واسطے تو جوان ماماؤں کو گھر میں رکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ خبر نہیں کہ یہ مردار کہاں سے آگئی۔ کوئی بات تو ہے۔ جو فضیحتے سنتی ہے۔ اور نکلنے کا نام نہیں لیتی" میاں بھی خفا ہو گئے۔ بغیر کھائے پیئے دفتر چل دیئے۔ غصہ اور بھوک کی جھانجھ میں کئی اہلکاروں سے لڑ پڑے۔ صاحب سے بھی کچھ اکھڑی اکھڑی باتیں کیں۔ ایک آدھ دفعہ تو وہ ٹال گئے۔ دو ایک دفعہ ذرا ڈانٹ دیا۔ اسی طرح منہ پھلائے گھر آئے آتے ہی بڑی غضبناک آواز میں کھانا مانگا۔ بیوی نے چپکے سے کہا "اگر کھانا ہی تھا تو صبح بھوکے کیوں گئے"۔ اس طعنہ نے غصہ اور بڑھا دیا۔ غلطی اپنی تھی۔ جواب کا کوئی پہلو نہ تھا۔ چپ ہو گئے۔ نوالہ جو منہ میں ڈالا تو نمک تیز۔ اب کیا تھا غصہ نکالنے کا موقعہ مل گیا۔ آپے سے باہر ہو گئے۔ رکابی اُٹھا کر جو پھینکی تو صحن میں گر کر چکنا چور ہو گئی۔ شوربے نے اِس سرے سے اُس سرے تک خاصہ چھڑکاؤ کر دیا۔ میاں نے بیوی کو اور بیوی نے میاں کو بُرے بُرے دیدوں سے دیکھا۔ اتنے میں چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ بیوی تو اُدھر گئیں۔ میاں کپڑے پہن باہر چلے گئے۔ نہ معلوم کہاں کھانا کھایا۔ رات کو دس بجے گھر میں آکر پڑ رہے۔ صبح اُٹھ پھر نکل گئے۔ غرض اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ بیوی نے ماما بیچاری کو بلا وجہ نکال باہر کیا۔ خود کئی دن روٹی ٹھونکی۔ آخر بڑی مشکل سے ایک بڑھیا ملی جس کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ کچھ وہ پکاتی کچھ یہ ہاتھ بٹاتیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح کام چلنے لگا۔ خدا جانے پھر کیونکر میاں بیوی میں ملاپ ہو گیا۔ مگر ہو گیا۔

تھوڑے دنوں خاصی طرح گزری۔ مگر میاں کو یاروں کی صحبت کا چسکا پڑ گیا تھا گھر میں ہر وقت پڑا رہنا موقوف ہوا۔ بچوں کی چیاؤں پیاؤں سے دل گھبرانے لگا۔ کبھی یار ان کے گھر کبھی یہ یاروں کے گھر گئے۔ آخر ایک دن شروع ہو ہی گئی۔ "یہ رات کو بھی کیوں آتے ہو۔ جہاں دن کو رہتے ہو رات کو بھی وہیں رہا کرو۔ یہ گھر اب گھر تھوڑی رہا ہے۔ سرائے ہو گیا ہے۔ بیوی بچاری سے تو واسطہ ہی کیا ہے۔ بچوں کو کبھی چھوڑ بیٹھو" بھلا ایک کمانے والے پر یہ اعتراض ہوں اور وہ چپ رہے۔ انہوں نے بھی دل کا بخار نکالا۔ "آخر تمہارے پاس بیٹھ کر بچے کھلایا کروں۔ یا آپ کی صاحبزادی کو جھولا جھلایا کروں۔ تم کو بچوں سے فرصت کب ہے جو میرا خیال کرو۔ اور خیال بھی کرو تو تم جیسوں کے ساتھ کیا خاک دل بہلے۔ تمہارے ساتھ بات کیسے تو کیا بات کرے۔ الف کے نام بے نہیں جانتیں۔ ایک تو جاہل دوسرے پھوہڑ۔ ادھر گھر کا گھورا بنا کر رکھا ہے۔ ادھر میں کچھ پڑھنے بیٹھا اور تم نے ناک بھوں چڑھائی۔ آخر تمام دن تھکنے کے بعد کچھ تو دماغ کو آرام ملے۔ بچے ہیں کہ غل مچا کر کان کھائے جاتے ہیں۔ تم ہو کہ لایعنی باتوں سے دماغ چاٹے جاتی ہو۔ اب یار دوستوں میں تھوڑی دیر دل نہ بہلاؤں تو کیا کروں۔ یہاں بیٹھا رہوں تو دیوانہ ہو جاؤں۔ اچھا ہوتا جہاں تمہاری پہلے ٹھیری تھی وہیں ہو جاتی۔ چالیس روپے میں مہینہ بھر کاٹنا پڑتا۔ جب حقیقت کھلتی۔ خدا کا شکر کرو۔ تین سو روپے مل رہے ہیں۔ بیگم صاحب بنی بیٹھی ہو۔" بیوی نے بھی طعنہ کا جواب طعنہ سے دیا۔ "تو آخر کس نے ظلم کیا تھا جو مجھ پھوہڑ پر مہربانی فرمائی۔ کسی پڑھی لکھی کو لیکر آئے ہوتے۔ گھر بھی دلہن بنا رہتا۔ یار دوست بھی آتے جاتے۔ بیوی صاحبہ کچھ سعی سفارش بھی کرتیں تنخواہ بھی بڑھتی۔ ماشاءاللہ دنیا میں کچھ نام بھی روشن ہوتا۔ کس نے منع کیا ہے۔ اب اپنی مرضی کی کوئی لے آؤ۔ تمہاری بھی تو پہلے کسی سے ٹھیری ہوئی تھی۔ اسی کو لے آؤ۔ دو سو روپیہ کی نوکر ہے تین سو تمہارے۔ دو سو اس کے پانچ سو ہو گئے۔ نواب بنے پھرو گے۔ لوگ کچھ بکتے ہیں بکنے دو۔ سلیقہ مند ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ شام کو ہوا خوری کو نکلتی ہے چلمن اٹھا دیتی ہے۔ اٹھا دینے دو۔ تمکو تو آرام دیگی۔ اخبار پڑھکر سنائیگی۔ کتابیں پڑھا کر بھی ہر بات میں قائل معقول کریگی۔ ہاں ذرا آپ نے کان ہلائے اور اس نے گھر سے نکال باہر کیا۔ تم کو تو ایسی ہی چاہیے ہم بچاری بے زبانوں کو تم کیوں خاطر میں لانے لگے۔" چلو ہو گئی۔ میاں اپنا پلنگ لے۔ باہر دیوانخانہ میں پہونچ گئے کھاتے بھی باہر سوتے بھی باہر۔

اب دونوں کے دماغوں میں کھدبد شروع ہوئی۔ میاں سوچے "چھوڑ دوں؟ نہیں بچے تباہ ہوجائینگے
بیوقوف ہے کسی طرح نہیں سمجھتی۔ ایک دن دو دن روز روز کا جھگڑا مجھ سے تو نہیں سہا جاتا۔ کچھ دیوانی ہوگئی ہے
لاحول ولا قوۃ۔ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ خدا مغفرت کرے۔ یہ اماں جان کی عنایت ہے۔ سر کھپیں میری بہن کی
بیٹی لاؤ۔ میری بہن کی بیٹی لاؤ۔ لیجئے یہ بہن کی بیٹی آئی ہیں۔ اجی لعنت بھیجو گزر رہی جائیگی۔ وہ بیچاری بھی کیا کرے
بچوں پر بچے ہوئے جاتے ہیں۔ ایک کو سنبھالے دو کو سنبھالے۔ آخر کس کس کو سنبھالے۔ مگر بھئی زبان بڑی
لمبی ہے۔ اس سے جی جلتا ہے۔"

بیوی علیحدہ پڑی سوچ رہی ہیں "میکے چلی جاؤں۔ اوں ہوں۔ وہ اور فراغت سے گلچھرے اڑائینگے
وہ تو خدا سے چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ بلا دفع ہو۔ میکے میں کیا کہیں گے۔ لڑ کر آئی ہے۔ ضرور اسی کا قصور رہا ہے
کچھ زبان چلائی ہوگی۔ سب سے زیادہ بھائی جان سے ڈر لگتا ہے۔ کہیں فوجداری نہ کر بیٹھیں۔ میرا تو کچھ نہیں جاتا
بچے تباہ ہوجائیں گے۔ جاؤں خوشامد کر کے بلا لاؤں نہیں اور شیر ہوجائیں گے۔ سمجھیں گے ڈر گئی۔ تھوڑے
دن یونہی چلنے دو۔ آپ ہی من جائیں گے۔ میکے تو نہیں جاتی۔ مجھکو تو یہیں مرنا بھرنا ہے۔ سچ پوچھو تو قصور میرا ہی ہے
کیا کروں زبان نہیں رکتی۔ بیچارے سارے دن محنت کر کے آتے ہیں۔ گھر میں گھسے اور بچوں کی گڑبڑ۔ آخر
آدمی ہیں کہاں تک سہے جائیں گے۔ یہ بچے بھی ایسے دلدر ہیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصہ بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہوجائے
اچھا کل دیکھا جائیگا۔

کل سے پرسوں اور پرسوں سے ہفتوں ہوگئے۔ ادھر میاں کو ضد آگئی۔ ادھر بیوی کو ضد آگئی۔
غرض جو تصفیہ پہلے منٹوں میں پھر دنوں میں اور بعد میں ہفتوں میں ہوتا تھا۔ وہ مہینوں میں بھی نہیں ہوا۔
یہاں یہ کھینچا تانی ہو رہی تھی کہ شہر میں انفلوئنزا کا زور ہوا۔ پہلے بیوی کا نمبر آیا۔ بیمار پڑیں علاج ہوئے
اچھی ہوگئیں۔ مگر میاں کو نہ اندر آنا تھا نہ آئے۔ حکیم جی سے خیریت پوچھ لیتے۔ دوا درمن میں
کمی نہ کرتے۔ لیکن گھر میں قدم نہ رکھتے۔ بیوی اچھی ہوئی تھیں کہ میاں پڑے۔ بخار ایک سو چار ایکسو
پانچ رہتا۔ تکلیف ایسی کہ کسی کروٹ چین نہ آتا۔ پھر بھی اس اللہ کے بندے نے زنانہ کمرے کے
دروازہ کا قفل نہ کھولنا تھا نہ کھولا۔ بیچاری بیوی سارے سارے دن اور ساری ساری رات کواڑ سے
لگی بیٹھی دراڑوں میں سے جھانکا کرتی چپکے چپکے روتی گود پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتی لیکن مردانہ

کمرہ میں کسی طرح گھسنا نہ ملا۔ کچھ دن اسی مصیبت میں گزرے۔ آخر خدا خدا کر کے میاں کی طبیعت ذرا سنبھلی
یہ ابھی پورے طرح اچھے نہ ہوئے تھے کہ چھوٹے لڑکے کو بخار چڑھا۔ اس بلا کا بخار تھا کہ الامان۔ تین روز
آنکھ نہیں کھولی۔ حکیم صاحب کا علاج چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع کیا۔ چوتھے دن جو میاں نے ڈاکٹر
صاحب سے حال پوچھا تو انہوں نے حالت نازک بتائی۔ کہا کہ "دونو پھیپھڑے خراب ہو گئے ہیں
بیمار پر رات بھاری ہوتی ہے۔ اگر رات گزر گئی تو صبح کچھ عرض کر سکوں گا۔" وہ تو یہ کہہ فیس لے رخصت
ہوئے اور انہوں نے کمرہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ ٹہلتے ٹہلتے رات ہو گئی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ گھڑی
گھڑی زنانہ کمرہ کے دروازہ تک جاتے دڑاڑوں میں سے جھانکتے۔ قفل کو ہاتھ میں لیتے جیب میں سے
کنجی نکال لیتے۔ پھر قفل چھوڑ کنجی جیب میں ڈال ٹہلنے لگتے۔ جب تنفس کی آواز زیادہ بڑھنے لگی تو نہ رہا گیا
قفل کھول آہستہ آہستہ نیچی نظریں کئے اندر گئے دروازہ آہستہ سے بند کیا۔ دیکھا بیوی بچے کی پٹی سے
لگی بیٹھی ہیں۔ انہوں نے آہٹ پاکر آنکھیں اونچی کیں۔ میاں کو دیکھکر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے پوچھا۔
"کتنا بخار ہے؟" کہا "کیسوچھ" پوچھا "دوائی دی؟" کہا "ہاں ابھی دی ہے" پوچھا "نرس کہاں گئی؟" کہا "وہ
خود بیمار ہو کر شام کو چلی گئی۔" اتنی باتیں کر یہ بھی دوسری پٹی سے لگ کر بیٹھ گئے۔ گھڑی گھڑی نبض پر
ہاتھ رکھتے۔ بدن ایسا جل رہا تھا جیسے گرم توا۔ سانس ایسا چل رہا تھا جیسے دھونکنی۔ پوچھا "یہ حال
کب سے ہے؟" کہا "کل سے اس وقت طبیعت زیادہ خراب ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔" اتنے میں بچہ
ہاتھ پاؤں کھینچنے شروع ہوئے۔ دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ آنسو آہستہ
آہستہ خود بخود بہنے شروع ہوئے۔ بچہ کو ہچکی آئی اور ہچکی کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا۔ بیوی کے ہاتھ پاؤں کانپنے
لگے۔ سر چکرایا۔ اور ایک دلدوز آواز نکلی "ہائے میرا بچہ"۔ میاں بھی لڑکھڑاتے ہوئے بیوی کے پاس
آئے۔ گرتی ہوئی کو سنبھالا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "بیگم صبر کرو ہم لوگوں کی ضدوں نے یہ دن دکھایا"۔
بیوی کے آنسوؤں سے میاں کا سینہ اور میاں کے آنسوؤں سے بیوی کا سر تر بہ تر ہو گئے۔ غم نے
دونوں کے دلوں کو توڑ دیا مگر ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ کے لئے جوڑ دیا۔

بات یہ تھی کہ دونوں غلطی پر تھے۔

پُرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے"۔ جس طرح یہ صحیح ہے اسی طرح یہ مثل بھی صحیح ہونی چاہیئے کہ "ماضی ماضی ہے اور حال حال یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے"۔ لیکن خدانخواستہ اگر انکی ٹکر ہوگئی۔ تو سمجھ لیجیے کہ بس وہی مصیبتیں پیش آئینگی جو مجھ غریب کو پیش آئیں۔ وہ کیا مصیبتیں تھیں انکو بھی سن لیجیے واقعات از سرتا پا غلط سہی مگر پڑھنے کی حد تک انکو سچ جانیے اور یقین کیجیے ورنہ پڑھنے میں خاک مزا نہ آئیگا۔ اگر آپ اس پر تیار ہیں تو بسم اللہ آگے چلیئے۔

آؤ حضرت تمھیں بھی دکھلادیں

سیر ماضی کی اس زمانہ میں

سنہ انیس سو کچھ میں ہم نے تعلیم سے فراغت پائی۔ اب نوکری کی تلاش ہوئی۔ ایک ریاست میں (نام کی جگہہ صفر) ہمارے خاندانی تعلقات تھے اسلیئے کالج سے نکلکر سیدھا ادھر کا رخ کیا۔ یہاں پہنچے تو کسی نے کہا کہ نوکری کرلو۔ کسی نے کہا ابھی تعلیم جاری رکھو۔ چونکہ کالج کا خیال دل سے ابھی تک محو نہیں ہوا تھا اور وہاں کے صحبتیں پیش نظر تھیں۔ اس لئے طبیعت نے اسی تجویز کو پسند کیا۔ اور ہم بھی اس دوسری پارٹی کے ساتھ ہوگئے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ صورت بھی خود بخود پیدا ہوگئی۔

اس ریاست میں میرے ایک عزیز ایک بہت ہی بڑے عہدہ پر تھے انھوں نے مجھ سے کہا ارے میاں۔ میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ یہاں کے ایک امیر اپنے چھوٹے صاحبزادہ کو تعلیم کیلیئے علیگڈھ بھیج رہے ہیں۔ میرا ان کے ہاں بہت اثر ہے اگر کہو تو تم کو اس لڑکے کا اتالیق بناکر بھیجنے کے لئے کہدوں تمہاری تعلیم مفت میں ہوجائیگی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نواب صاحب بڑے رسوخ کے آدمی ہیں۔

نوٹ۔ یہ مضمون بالکل فرضی ہے۔ کوئی صاحب اسکو اپنے سے متعلق نہ فرمائیں۔

واپسی کے بعد تمھیں کوئی اچھی جگہ مل جائیگی" میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے" دوسرے تیسرے ہی روز انھوں نے مجھے بُلا کر کہا "لو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے نواب صاحب سے تمھارے متعلق سب تصفیہ کر لیا ہے مگر وہ چاہتے ہیں کہ چند روز تم کو اپنے پاس رکھکر تمھاری طبیعت کا اندازہ کر لیں۔ تم کو کبھی پُرانی وضع کے نوابوں میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تم بھی اس عرصہ میں ان کی نشست برخاست کے طریقے اور ادب آداب کے سلیقے سیکھ جاؤ گے۔ چھوٹے صاحبزادے صاحب کی طبیعت کا رنگ بھی معلوم ہو جائیگا اور انشاءاللہ اسطرح تم کچھ فائدہ ہی میں رہو گے" میں راضی ہو گیا۔ قرار یہ پایا کہ سہ پہر کو اُن کے مددگار صاحب لیجا کر مجھے نوابصاحب کی خدمت میں پہنچا دیں۔ اور تعارف بھی کرا دیں۔

اب آپ نواب صاحب کے نام کی جگہ نقطے سمجھ لیجئے۔ اور مددگار صاحب کے اسم شریف پر لکیر کھینچ دیجئے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ سچی بات بُری معلوم ہوتی ہے۔ کہیں نام بتا کر میں خود مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ اسلئے بہتر یہی ہے کہ

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

بہر حال دو بجے ہی سے ہم نہا دھو۔ کپڑے بدل۔ سیاہ ٹرکش کوٹ ڈانٹ۔ دستار پہن اور بگلوس باندھ تیار ہو گئے۔ یہاں ننگے سر رہنے کی عادت تھی۔ دستار سر پر بار ہو گئی۔ اگرچہ "شملہ بمقدار علم" کے لحاظ سے اس دستار کا بوجھ کچھ زیادہ نہ تھا پھر بھی رہ رہ کر یہی جی چاہتا تھا کہ اسکو الگ ہی رہنے دو۔ اُتار کر رکھدو اور ننگے سر ہی چلے چلو۔ مگر کیا کیا جاتا۔ وہ نواب صاحب پُرانی وضع کے ایسے دلدادہ تھے کہ ننگے سر جانا یقیناً خالی ہاتھ آنے کی صورت اختیار کر لیتا۔ اسلئے "قہر درویش بر جان درویش" سمجھکر اس بار کو اُٹھانا ہی پڑا۔ ابھی دستار کا تصفیہ پوری طرح نہ ہوا تھا کہ بگلوس نے ستانا شروع کیا۔ پیٹی باندھتے عمر گزری تھی۔ مگر کوٹ کے نیچے پیٹی باندھتے تھے نہ کہ کوٹ کے اوپر۔ کوٹ کے اوپر باندھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر ہاتھ ہلا اور ادھر کوٹ بگلوس کے اوپر گولا بنگیا۔ دامن پکڑ کر نیچے گھسیٹا۔ برابر کیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی مُشکل

پیش آئی اور یہی ترکیب سے پھر رفع کی۔ ہم اس کشمکش میں تھے کہ مددگار صاحب اپنی وکٹوریہ میں آہی گئے۔ اور ہم کوٹ کا دامن نیچے کھینچتے اور دستار کو درست کرتے گاڑی میں جا بیٹھے۔ چلتے چلتے آندھ آگئے۔ آخر خدا خدا کر کے نواب صاحب کا مکان آیا۔ گاڑی سے اُترے۔ آگے مددگار صاحب اور پیچھے ہم نواب صاحب کی عالیشان اور پُرتکلف کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ تین بج چکے تھے مگر معلوم ہوا کہ ابھی نواب صاحب آرام میں ہیں۔ اسلئے دونوں کے دونوں بلیرڈ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد رپورٹر ایجنسی کیطرح اطلاعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے خبر آئی کہ نواب صاحب بیدار ہوئے۔ پھر اطلاع آئی کہ آنکھیں ملتے مسہری سے اُٹھے۔ پھر کہا گیا کہ ہاتھ دھو رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ منھ دھو رہے ہیں۔ چوبدار پر چوبدار آتے اور بیان کرتے کہ اب یہ ہو رہا ہے۔ اب یہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ پرچہ لگا کہ اب شیروانی کی آستین میں ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ خبر آنی تھی کہ کمرہ کا رنگ ہی بدل گیا۔ یا تو ہم ٹنڈروں ٹوں دو ہی آدمی بیٹھے تھے یا سارا کمرہ آدمیوں سے بھر گیا۔ کوئی اِدھر سے آیا۔ کوئی اودہر سے۔ کوئی اس کمرہ سے نکلا۔ کوئی اُس کمرہ سے۔ غرض اتنے بڑے کمرہ میں تِل رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ مددگار صاحب سے سب کی صاحب سلامت تھی۔ نواب صاحب انکو بہت چاہتے تھے۔ پھر بھلا مصاحبین کا کیا حوصلہ تھا جو اِن سے جھک کر نہ ملتے۔ البتہ مجھکو دیکھکر ذرا کھنچتے تھے۔ اکثروں نے اپنی ناکیں ذرا اوپر چڑھا کر چھوڑ دیں۔ بعضوں کی پیشانی پر بل بھی آیا۔ مگر جب مددگار صاحب نے میرا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ میں کس خاندان سے ہوں تو ذرا ٹھنڈک پڑی۔ ایک صاحب کہنے لگے "سبحان اللہ اس خاندان کا کیا کہنا ہے۔ آفتاب ہے آفتاب۔ ارے بھئی میر صاحب تم نہیں جانتے۔ ان کے دادا صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کی لکھنؤ میں کیا قدر تھی۔ واللہ عجیب آدمی تھے۔ اور بھئی ذرا دیکھنا ان کی شکل مرزا صاحب مرحوم سے کتنی ملتی ہے۔ میں نے تو اُن کو بڑھاپے ہی دیکھا ہے۔ واللہ جوانی میں عین میں ایسے ہی ہونگے۔"
مجھکو یہ دیکھکر بڑا تعجب ہوا کہ تقریباً سب کے سب مصاحبین لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ اور سب دادا صاحب مرحوم کو جانتے اور اچھی طرح جانتے تھے۔ بہر حال یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ سرکار برآمد ہونے والے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ سب کے سب اپنی دستاریں سنبھالتے۔ کپڑوں کو ٹھیک کرتے اور گلگلوس باندھتے باہر نکل آئے۔ اب

تھوڑا سا اس مکان کا نقشہ بھی سُن لیجیے۔ کوٹھی کیا ہے کسی بڑے بادشاہ کا محل ہے۔ قیامت کی کرسی ہے۔ سامنے بہت بڑا میدان ہے۔ اس میں سے ایک چوڑی سڑک چکر کھاتی ہوئی سیڑھیوں تک آتی ہے۔ سیڑھیوں کے بعد صحن چبوترہ اور صحن چبوترہ کے بعد پھر سیڑھیاں ہیں۔ اور یہیں سے کئی منزلہ مردانہ مکان شروع ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں پرانا دقیانوسی سامان بھرا ہوا ہے۔ ان کمروں کے سامنے جو برآمدہ ہے اُس میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں لاوارث حاجتمندوں کے لیئے پڑی رہتی ہیں۔ ان کرسیوں سے مجھکو بھی واسطہ پڑا ہے۔ اس کا ذکر آیندہ کرونگا۔ جو بڑی سڑک چکر کھا کر محل سرا کے دروازہ کو گئی ہے وہ بلیرڈ روم کے سامنے سے گزرتی ہے۔ اور یہاں اتنی چوڑی ہو گئی ہے کہ اچھا خاصہ صحن نکل آیا ہے۔ بلیرڈ روم کے بالکل سامنے دوسری منزل سے نیچے آنیکا زینہ۔ اور اُس کے بائیں طرف اوپر کے بڑے کمرہ کے سامنے چھوٹا سا چھجّہ ہے۔ چھجّہ کے اوپر نہایت خوبصورت نیچی سی مُنڈیر ہے۔ بس میرے مضمون کے لیئے مکان کا اسیقدر ہی نقشہ بالکل کافی ہے۔

خیر۔ تو ہم سب یہ سُنکر کہ نواب صاحب برآمد ہونیوالے ہیں۔ کمرہ سے باہر نکل آئے اور اسطرح لائن باندھکر کھڑے ہوئے کہ یہ چھجہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ بلیرڈ روم ہمارے بائیں طرف اور زینہ ہمارے دائیں جانب۔ ہر شخص کی نظر اس چھجہ پر لگی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ ہی چوبدار نے آواز دی۔ "آداب بجا لاؤ"۔ اس آواز کے سنتے ہی سب تو ایک دفعہ ہی رکوع میں گئے۔ مگر میں نے جُھکنے سے پہلے ایک چلتی سی نظر نواب صاحب پر ڈال لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب چھجہ پر کھڑے ہیں۔ مگر بالکل اسطرح کہ گویا فوٹو اُتروا رہے ہیں۔ میں نے ولایت کی ایک مشہور تصویر دیکھی ہے جس میں ایک بارہ سنگھے کو پہاڑ کی چوٹی پر نہایت اکڑ کر کھڑے ہوئے دکھایا ہے۔ اُس کے نیچے لکھا ہے

I am the monarch of all I survey

بس سمجھ لو کہ وہی رنگ تھا۔ نیچے صرف یہ لکھنا باقی تھا۔

"جدھر دیکھتا ہوں اُدھر میں ہی میں ہوں"

یہ غلط انداز نظر ڈالنے کے بعد میں بھی تسلیم کو جُھکا۔ ہماری اصطلاح میں "سلام کرنا" محض ماتھے کے سامنے ہاتھ لے جانیکو کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑے آدمی ہیں۔ ذرا جُھک کر

اس فرض کو ادا کر دو، جھکا۔ سلام کیا۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن ادھر اُدھر جو دیکھتا ہوں تو سب لوگ جھکے ہوئے زنا زن ہاتھ چلا رہے ہیں۔ "نقل را چہ عقل" میں نے بھی غپ رکوع میں جا پٹا کے ہاتھ چلانے شروع کر دیئے۔ مگر کن انکھیوں سے دوسروں کو دیکھتا رہا۔ جب دیکھا کہ اب سب سیدھے ہو گئے تو میں نے بھی سیدھے کھڑے ہو نیت کیطرح ہاتھ باندھ لیئے۔

مگر حضرات آپ ہنستے کیوں ہیں۔ کیا عید۔ بقرعید کی نماز میں اپنی حالت بھول گئے ؟ آپ ہر سال نماز پڑھتے ہونگے۔ مگر ہر مرتبہ تکبیر کے وقت خدا کے فضل سے ادھر اُدھر دیکھنا ہی پڑتا ہوگا کہ دوسروں کے ہاتھ کھُلے ہوئے ہیں یا بندھے ہوئے۔ دوسرے رکوع میں جا رہے ہیں۔ یا ابھی اور کوئی تکبیر باقی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہمیشہ ایسی ہی الجھنیں پیدا کرتی ہیں۔ پھر آپ کا میرے حال پر مسکرانا یقیناً بیجا ہے۔

جب اس تسلیمات کے جھگڑے سے نجات پا کر میں نے اوپر نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ میری حرکت کا اثر ہے۔ جی میں تو آیا کہ لاحول ولا قوۃ تو کس مصیبت میں پڑا۔ چل گھر چل۔ پھر سوچا ذرا یہاں کا رنگ بھی دیکھ لو۔ نئی چیز ہمیشہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لطف کا بھی مزہ اٹھالو۔ میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا "اوہو۔ یہ ہمارے چھوٹے میاں کے ماسٹر صاحب ہیں؟" چلو چھٹی ہوئی۔ خدا نے خود بخود تعارف کرا دیا۔ مددگار صاحب نے کہا "جی ہاں" نواب صاحب مسکراتے ہوئے نیچے اُتر آئے۔ میری تعلیم کا حال پوچھا۔ میں نے بیان کیا۔ میرے خاندان سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ نام بنام ایک ایک کا ذکر کرتے اور تعریف کرتے۔ غرض ان ہی باتوں میں شام ہو گئی۔ جب سب رخصت ہونے لگے تو فرمایا "ماسٹر صاحب آپ دونوں وقت آیا کیجئے۔ میں عموماً یہیں ہوتا ہوں۔ اگر یہاں نہ بھی ہوا تو جہاں ہونگا چوبدار آپ کو پہنچا دینگے" دربار برخاست ہوا اور سب لوگ بگلوس کھولتے ہوئے بلیرڈ روم میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے "ماسٹر صاحب آپ نواب صاحب کو مخاطب کرنے میں ہمیشہ "آپ۔ آپ" کہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا "آپ نہ کہوں تو کیا "تم" کہوں۔ ؟ اردو میں تو "آپ" ہی تعظیم کا لفظ ہے" کہنے لگے "نہیں۔ "سرکار" کہیئے۔ "خداوند نعمت" کہیئے۔ "خاوند" کہیئے" میں نے کہا "میر صاحب یہ موٹے موٹے لفظ

تو مجھ سے ادا ہونے مشکل ہیں۔ ہاں کل سے "سرکار" کہنے کی کوشش کرونگا۔" مگر خدا معلوم زبان کو لفظ "سرکار" سے کیا چڑھ تھی کہ کبھی یہ لفظ منہ سے نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔ اور ہمیشہ "جنابِ عالی" اور "جنابِ والا" ہی سے کام چلا کیا۔

ایک دوسرے صاحب فرمانے لگے "ماسٹر صاحب آپ کا دولت خانہ بہت دور ہے صبح آجایا کیجئے۔ دوپہر کا خاصہ یہیں تناول فرمائیے۔ شام کو تشریف لیجایا کیجئے۔ ایک کمرہ میں آپکے اُٹھنے بیٹھنے کا انتظام کئے دیتے ہیں۔" میں نے کہا "حضرت یہ دوسروں کے مکان ہیں آپ انتظام کرنے والے کون۔؟ اگر نواب صاحب کو میرے ٹھہرانے کا خیال ہوتا تو وہ خود ہی فرما دیتے۔ خدا میری بائیسکل کو سلامت رکھے۔ میرے لئے دور اور نزدیک سب برابر ہیں۔" وہ بیچارے شرماکر خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے ہم نے دربار کے اوقات بھی پوچھ لئے۔ معلوم ہوا کہ صبح کے نو بجے سے گیارہ بارہ بجے تک اور شام کے تین ساڑھے تین بجے سے سات آٹھ بجے تک نواب صاحب برآمد رہتے ہیں۔

دوسرے روز ہم صبح ساڑھے آٹھ ہی بجے سے پہنچ گئے۔ ایک چوبدار سے پوچھا کہ "نواب صاحب کس طرف برآمد ہونگے"؟ اُس نے کہا "میرے ساتھ آئیے۔" ہم ساتھ ہو گئے۔ اُس نے لیجا برآمدہ کی اُن ہی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا جس کا میں نے کہیں اوپر ذکر کیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا۔ نواب صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ جو چوبدار ادہر سے نکلتا اُس سے پوچھتا کہ "بھئی نواب صاحب آج برآمد ہونگے بھی یا نہیں"؟ وہ یہی کہکر چلا جاتا کہ "آپ تشریف رکھیئے ابھی یاد ہوتی ہے۔" جب ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اُٹھکر دوسری پر جا بیٹھتا۔ ایک تو ٹوٹی ہوئی کرسیاں۔ دوسرے اسطرح جم کر بیٹھنے کی عادت نہیں۔ تیسرے تنہائی کی کوفت۔ غرض کیا کہوں کہ کیا حال ہوا۔ جیب سے گھڑی نکالتا۔ دیکھ لیتا۔ اِدھر پاؤں بیٹھے بیٹھے سُن ہو گئے۔ اُدھر دستار کے بوجھ اور بگلوس کے دباؤ نے پریشان کر دیا۔ اور ایک ایک منٹ کا کٹنا مشکل ہو گیا۔ آخر خدا خدا کر کے دن کے بارہ بجے کی توپ چلی۔ اُسوقت ایک چوبدار نے آکر کہا "اب آپ جائیے۔ سرکار محل میں تشریف لیگئے۔ شام کو آئیے گا تو ملاقات ہوگی۔" کیا بتاؤں کسقدر غصہ آیا لیکن مجبور ہو کر

ہوکر رہگیا۔ آخر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور سائیکل سنبھال گھر آیا۔ شام کو جانے کا ارادہ نہ تھا مگر لوگوں کے کہنے سُننے سے پھر پہنچا۔ ایک چوبدار نے لیجا پھر اُن ہی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ خیال تھا کہ شاید اس مرتبہ مشکل آسان ہوگی۔ مگر وہاں کون کسکو پوچھتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے شام کے چھ بجگئے۔ اُس وقت میں نے دل میں کہا "حضرت اگر یوں ہی ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے رہے تو تمام عمر بھی نواب صاحب کو اطلاع نہ ہوگی۔ چلو بغیر اطلاع ہی پہنچ جاؤ۔ راستہ تو معلوم ہے۔ ہو نہ ہو۔ نواب صاحب اُسی طرف ہونگے جدھر کل تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بلا اطلاع چلے آنے پر خفا ہوجا ئینگے۔ خفا ہوتے ہیں تو ہوجائیں۔ تم روٹھے۔ ہم چھوٹے" یہ سوچ۔ کرسی سے اُٹھا۔ کمرہ میں سے ہو۔ بلیرڈ روم میں آیا۔ یہاں نواب صاحب کی آواز صاف آرہی تھی۔ اسی آواز کی سیدھ میں چلا۔ دیکھا تو کمرہ کے باہر ہی نواب صاحب اور اُن کے سب مصاحب کھڑے ہیں۔ میں بھی جا۔ تسلیمات بجالایا۔ اس مرتبہ اُس پڑھے ہوئے سبق کو ذرا اچھی طرح دُہرایا۔ پُرانے مشاقوں کی طرح ہاتھ میں لوچ تو نہ تھا۔ بلا سے نہ ہو۔ مگر ہاتھ کے جھٹکے سات کے بجائے آن گِنت دے ڈالے۔ جب اس کارروائی سے فارغ ہوا تو نواب صاحب مسکرا کر کہنے لگے "اجی ماسٹر صاحب! آپ صبح کو کہاں غائب رہے؟ مجھکو تو آپکا بڑا انتظار رہا" میں نے کہا "جناب عالی! میں تو صبح کو بھی آیا تھا۔ مگر کسی نے اطلاع ہی نہیں کی۔ آخر بارہ بجے چلا گیا۔ اب بھی وہی صورت پیش آتی۔ اگر میں خود بغیر اطلاع نہ چلا آتا" یہ سُنکر نواب صاحب کو بہت غصّہ آیا۔ کہنے لگے "آپ آئے تھے؟ اور مجھے اطلاع نہیں دیگئی۔ اس کے کیا معنی۔ میں نے تو کل ہی کہدیا تھا کہ میں جہاں بھی ہوں آپ کی اطلاع کردی جائے" میں نے کہا "دیکھیئے وہ چوبدار صاحب پیچھے کھڑے ہیں۔ انھوں ہی نے مجھے وہاں ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر لیجا کر بٹھایا تھا۔ اور کہا تھا کہ "ابھی سرکار برآمد نہیں ہوئے" کئی دفعہ بعد میں اُدھر سے گزرے بھی مگر ہمیشہ میرے پوچھنے پر یہی جواب دیا کہ "ابھی عرض کردیتا ہوں" اور وہ جو اُن کے برابر کھڑے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آٹھ دس مرتبہ اُن سے کہا مگر انھوں نے صرف گردن کے جھٹکے ہی پر ٹالا" غرض میں نے ایک ایک کو لے ڈالا۔ جتنے چوبدار تھے۔ سب نیلی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن میں نے جب تک سب کی خبر نہ لے لی چُپکا نہ ہوا۔ ایک چوبدار نواب صاحب کے بہت مُنھ چڑھے ہوئے تھے وہ کچھ ہمّت کر کے آگے بڑھے اور ہاتھ باندھکر کہا "سرکار" مگر میں نے اُن کو آگے

چلنے نہ دیا اور کہا "کیا سرکار۔ سرکار لگائی ہے۔ کوئی بات میں نے غلط کہی ہے جس کی اب آپ تصحیح
فرما رہے ہیں۔ بس خاموش رہو۔ اسطرح باتوں میں دخل دینا تمھارا کام نہیں ہے۔" وہ پھر کچھ کہنا چاہتے
کہ میں نے "خاموش" اس زور سے کہا کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بیچارے سمجھے ہونگے کہ کہیں
یہ حضرت زبان سے ہاتھ پر نہ اُتر آئیں؟ پہلے تو نواب صاحب کی پیشانی پر کچھ بل آئے مگر پھر ہنسنے
سمجھے ہونگے کہ پُرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہے۔ مگر اُس روز سے چوبداروں کا یہ حال ہو گیا کہ میری
شکل سے گھبراتے تھے۔ میں گیا۔ اور وہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "آئیے آئیے"۔ نواب صاحب کہہ
ہوں۔ مجھے فوراً وہاں پہنچا دیتے۔ نواب صاحب کے چاہیتے چوبدار صاحب تو ایسے پریشان ہو گئے
کہ اگر میں جاتا اور نواب صاحب واقعی محل میں ہوتے تو مجھ سے کہتے کہ "ماسٹر صاحب! سرکار محل سے
ابھی برآمد نہیں ہوئے۔ آپ جا کر خود کمرہ دیکھ لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ سمجھیں میں غلط عرض کر رہا ہوں۔"

علم مجلس کا رنگ جیسا میں نے یہاں دیکھا۔ نہ پہلے کبھی دیکھا تھا۔ اور نہ دیکھنے کی آرزو ہے۔
اس نوابی دربار میں میری صاف گوئی بعض وقت عجیب رنگ لاتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت
دربار گرم تھا کہ دو سائیس صاف ستھری وردیاں پہنے۔ ریشمی باگ ڈوریں ہاتھوں میں لیئے۔ ایک
خوبصورت گھوڑے کو ملاحظہ کیلیئے لائے۔ یہ گھوڑا اُسی دن آسٹریلیا سے آیا تھا۔ اور نواب صاحب نے
کوئی تین ہزار روپیے کو خریدا تھا۔ گھوڑے کو نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے شکر کھلائی۔ کچھ
بڑھکر اُس کی پیشانی پر دم کیا اور کہا "بھئی عجیب چیز ملی ہے۔" بس اتنا سننا تھا کہ مصاحبوں نے
تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ گھوڑے کا مقابلہ بُراق اور رَف رَف تک سے کر ڈالا۔ غرض دو
گھنٹے تک یہی بے سروپا گفتگو ہوتی رہی۔ شامتِ اعمال دیکھو کہ نواب صاحب کا ایک اور گھوڑا تھا
اُس کو یہ بہت ہی چاہتے تھے۔ جب تعریفوں کی کوئی انتہا نہ رہی اور نواب صاحب کو ڈر ہوا کہ کہیں
میرا پیارا گھوڑا اس نئے گھوڑے نہ دب جائے۔ تو اُنھوں نے کہا "یہ سب کچھ سہی مگر ہمارے
گھوڑے زنام تبانا گویا سارے راز کا افشا کرنا ہے) سے اچھا تھوڑی ہو سکتا ہے؟" یہاں تو
سب سرکار کے نوکر تھے۔ بیگن کے نوکر تو تھے ہی نہیں۔ فوراً بدل گئے۔ ایک صاحب کہنے لگے
"خداوند نعمت! بھلا گھوڑوں کے تذکرہ میں اُسکو کیسے لایا جا سکتا ہے۔ وہ گھوڑا تھوڑی ہے۔

وہ تو انسان ہے انسان!!" ان کا اتنا کہنا تھا کہ یار لوگوں کو گفتگو کا سلسلہ مل گیا۔ اب کیا تھا۔ اس دوسرے گھوڑے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ جب کہیں جاکر نواب صاحب کو تسکین ہوئی۔ اسطرف سے ذرا فراغت پائی تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھکر ارشاد فرمایا۔ "مرزا صاحب! آپ نے اس گھوڑے کے متعلق کچھ نہیں کہا" میں نے عرض کی "جناب عالی! مجھے نہ اس بارے میں کوئی واقفیت ہے اور نہ تعریف کرنیکے لئے الفاظ۔ میں سرے سے گھوڑے پر چڑھنا ہی نہیں جانتا۔ سائیکل پر سوار ہوتا ہوں۔ اُسکا ایک ایک پُرزہ پہچانتا ہوں۔ ماشاءاللہ جب اتنے واقفکار لوگ تعریف کر رہے ہیں تو گھوڑا اچھا ہی ہوگا۔ اگر سچ پوچھیئے تو میں اس تمام گفتگو میں یہ بھی نہیں سمجھا کہ گھوڑے کے کس کس جوڑ بند کی تعریف ہو رہی ہے" نواب صاحب یہ سنکر مُسکرانے لگے۔ خیر اِن ہی باتوں میں کوئی آٹھ بجگئے۔ اور دربار برخاست ہوا۔ اب دوسرے دن شام کا ذکر سُنیئے کہ نواب صاحب نے حکم دیا "ہمارا اپنا گھوڑا لاؤ" سائیس اُسیطرح بنا سنوار کر گھوڑے کو لائے مگر بجائے چلنے کے وہ پُھدکتا ہوا آیا۔ چار ٹانگ کے گھوڑے کی جگہ تین ٹانگ کا گھوڑا رہگیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ نواب صاحب آگ بگولا ہوگئے۔ اور اس سرے سے اُس سرے تک سارے سائیسوں اور کوچوانوں کو لے ڈالا۔ مصاحبوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایک صاحب نے اس ٹانگ ٹوٹنے کو جادو کا اثر بتایا۔ دوسرے نے سائیس کی لاپروائی کو سبب ٹھہرایا۔ غرض جتنے مُنھ اُتنی باتیں۔ مگر آخر کار بغلبۂ آرا یہ تصفیہ ہوا کہ دوسرے گھوڑوں کے سائیسوں نے جل کر اس کی ٹانگ توڑ ڈالی ہے۔ قرار پایا کہ تمام سائیس یکقلم موقوف۔ میں نے جو اِن غریبوں پر بلا وجہ آفت آتے دیکھی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ آگے بڑھکر کہا "جناب والا! کل تعریفوں کے جوش میں خیال نہیں فرمایا گیا کہ یہ گھوڑا لنگڑا ہے۔ اگر ذرا غور سے گھوڑے کو ملاحظہ فرمایا گیا ہوتا تو کل ہی معلوم ہو جاتا کہ یہ گھوڑا تین ٹانگ کا ہے۔ کل بھی چلنے میں یہ ایک پاؤں پر زور نہیں دیتا تھا" میرا یہ کہنا تھا۔ کہ جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے سب نے بُرے بُرے دیدوں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ جانتے تھے کہ جھاڑ کا کانٹا ہو کر کہیں لپٹ نہ جائے۔ نواب صاحب کو بھی ذرا بُرا معلوم ہوا کہنے لگے "ماسٹر صاحب! اگر آپ کو معلوم ہوا تھا کہ گھوڑا لنگ کرتا ہے تو کل ہی کیوں نہ کہا"؟ میں نے کہا "جناب عالی! جب اتنے حضرات تعریف کر رہے ہوں تو بھلا میری کیا مجال ہے جو اِن سب کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکوں۔

اگر یہ حضرات گھوڑے کی تعریف کے بجائے میری مذمت پر اُتر آتے تو میں کہاں ان سے پیچھا چھڑاتا پھرتا۔ میں سمجھا کہ گھوڑے کا لنگڑا پن بھی کوئی تعریف ہے جو اس کی طرف توجہ نہیں کیجاتی۔" نواب صاحب نے فرمایا" ان سے نہیں تو چپکے سے مجھ ہی سے کہدیا ہوتا۔" میں نے کہا" عالی جناب کو تعریفیں سننی ہی سے کب فرصت تھی جو مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع ملتا۔" قصہ مختصر سارا الزام میرے سر منڈھ دیا گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بیچارے سائیسوں پر سے آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔ جب مصاحبوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ماسٹر صاحب کے پاؤں یہاں جم گئے تو انھوں نے بھی مجھ سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی۔ بلاتے پاس بٹھاتے۔ پان کھلاتے۔ ادھر ادھر کی گپیں اُڑتیں۔ شعر و سخن کے چرچے رہتے۔ غرض کچھ دنوں اچھی گزری۔ میں اُس زمانہ میں تحت اللفظ خوب پڑھتا تھا۔ سب نے صلاح دی کہ نواب صاحب کی مجلسوں میں تم بھی دو ایک مرثیہ پڑھو۔ نواب صاحب سُنکر بہت خوش ہونگے۔ میں راضی ہو گیا۔ چند ہی روز بعد محرم آگیا۔ نواب صاحب کو بھی شاید کسی نے اطلاع کر دی تھی۔ اُنھوں نے فرمایا "ماسٹر صاحب! آپ بھی مجلسوں میں شریک ہوا کیجیے۔" میں نے کہا "بہت خوب۔" دوسرے روز شام کے (۶) بجے مجلس میں شریک ہوا۔ مجلس زنانہ مکان میں ہوئی۔ اندر پردہ ہو گیا۔ محلسرا کے وسط میں جو عمارت ہے اُس کے دالانوں میں پردے ڈال کر دو حصے کر دیئے۔ ایک حصہ میں مردانہ۔ دوسرے میں زنانہ۔ اندر کا حال تو معلوم نہیں۔ مگر مردانہ حصہ کا کُل فرش سیاہ تھا۔ چاندنیاں سیاہ۔ گاؤ تکیے سیاہ۔ قالین سیاہ۔ ممبر سیاہ۔ یہاں تک کہ تمام گھر والوں کا سارے کا سارا لباس دستار سے لگا کر جرابوں تک سیاہ۔ نواب صاحب ممبر کے سامنے قالین پر گاؤ تکیہ لگا کر اور تمام صاحبزادے اُن کے کچھ اِدھر کچھ اُدھر بیٹھ گئے۔ چھوٹی صاحبزادی صاحبہ تھیں وہ نواب صاحب کے پہلو میں آ بیٹھیں۔ اور اشارہ کے ساتھ ہی مجلس شروع ہوئی۔ پہلے سوزخوانی ہوئی۔ یہ نہ پوچھیے کہ کس طرح ہوئی۔ کئی سوزخوان تھے۔ شاید ہی کسی کو چند منٹ پڑھنے کو دیئے گئے ہوں ورنہ جس کو اور جہاں کہیں نواب صاحب نے چاہا روک دیا۔ روکنے کے لیئے صرف ہاتھ کا اشارہ کیا جاتا تھا کہ "بس" ایک صاحب چار مصرعے پڑھنے کے بعد ٹیپ اُٹھانا چاہتے تھے کہ "بس" کا اشارہ ہوا اور ان کی آواز کو پنچم سے مدھم پر آنا نصیب نہ ہوا۔ جب یہ جماعت ختم ہوئی تو تحت اللفظ پڑھنے والوں کی باری آئی۔ کسی نے خوش قسمتی سے چار پانچ بند پڑھ لیئے تو کمال کیا۔ ورنہ دو ہی بندوں پر

بند کر دیے گئے۔ اس سلسلہ کے ختم ہونے کے بعد حلقہ کا ماتم شروع ہوا۔ ماتم کے بعد ہی مجلس ختم ہوئی۔ باہر نکلکر سب نے اصرار کیا کہ "کل آپ بھی پڑھیئے"۔ میں نے کہا "حضرت میں مجلس کا رنگ دیکھ چکا۔ بھلا ایسے پڑھنے میں کیا لطف۔ اور سننے میں کیا مزا۔ مجھے تو معاف ہی فرمائیے"۔ مصاحبین میں ایک میر صاحب تھے۔ بڑے بامزہ آدمی تھے۔ کہنے لگے "مرزا صاحب! آج جن لوگوں نے پڑھا وہ پڑھنا نہیں جانتے۔ کل میں دکھاؤں گا کہ کیونکر پڑھتے ہیں۔ دیکھوں تو نواب صاحب بیچ میں کیسے روک دیتے ہیں"۔ دوسرے دن جب میر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے مرثیہ کو بجائے ابتدا سے پڑھنے کے وسط سے شروع کیا اور پہلی ہی بند پر میدان میں اتر آئے۔ مرثیہ واقعی اچھا تھا۔ سب لوگ نہایت غور سے سن رہے تھے۔ میر صاحب نے تلوار تول کر اٹھائی۔ چاہتے تھے کہ ہاتھ ماریں۔ کہ "بس" کا اشارہ ہوا۔ اور میر صاحب تلوار علم کیئے ہوئے ممبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ اس کے بعد سب نے مجھپر زور دیا کہ پڑھو۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے بھی ایک آدھ دفعہ اشارتاً فرمایا۔ مگر میں ٹال گیا۔ اور اسطرح سنتے ہی سنتے یہ مجلسیں ختم ہو گئیں۔

محرم کی تیرھویں یا چودھویں تاریخ تھی۔ صبح آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ دربار جما ہوا تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ ایک دفعہ ہی نواب صاحب کو کچھ خیال آگیا۔ حکم دیا کہ "ہمارے جواہر خانہ سے چھوٹا صندوقچہ لاؤ"۔ چوبدار صندوقچہ لے آیا۔ اوپر کارچوبی کام سے لپا ہوا سبز مخمل کا غلاف۔ اندر ہاتھی دانت کا صندوقچہ۔ صندوقچہ پر گنگا جمنی جالی کا کام۔ ایسی خوبصورت چیز تھی کہ کیا کہوں۔؟ نواب صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ پہلے ایک انگوٹھی نکالی۔ اسکو دیکھا بھالا اور رکھ دیا۔ اسکے بعد سونے کی ایک جڑاؤ گھڑی نکالی اسکو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا اور رکھدیا۔ پھر ایک چھوٹے چھوٹے سبز دانوں کی تسبیح نکالی۔ اچھی طرح دیکھی بھالی۔ اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں سمجھا کہ مجھے دکھانے کو دیتے ہیں۔ میں نے تسبیح لیکر خوب غور سے دیکھا۔ مگر سمجھ میں نہ آیا کہ شیشہ ہے یا زمرد۔ دیکھنے کے بعد جسطرح لی تھی اسیطرح واپس کر دی۔ اور کہا "جناب والا! مجھے جواہر کی پرکھ نہیں۔ ممکن ہے زمرد ہو کسی جوہری کو دکھائیے۔ وہ مجھسے بہتر بتا سکیگا"۔ نواب صاحب نے مسکرا کر تسبیح صندوقچہ میں بند کی اور صندوقچہ واپس بھیجدیا۔ جب دربار برخاست ہوا تو یار لوگوں نے میرا مذاق اڑانا شروع کیا کہ "واہ ماسٹر صاحب! خوب سمجھے۔ اجی حضرت! تسبیح آپکو سرفراز ہوئی تھی۔

آپ نے غضب کیا کہ واپس کر دی۔ سلام کر کے لے لیتے۔ نذر گزرانتے۔ بھلا ایسے موقعے کہیں روز روز ملتے ہیں؟ ہم کو دیکھنے کے لئے بھی کوئی چیز دی جاتی ہے تو ہم سلام کر کے اپنی کر لیتے ہیں۔"
میں نے کہا "حضرت! یہ لوٹ مار آپ ہی کو مبارک ہو۔ اگر نواب صاحب کا ارادہ تسبیح دینے ہی کا تھا تو زبان کس نے بند کی تھی؟ بھلا میری عمر دیکھو اور تسبیح کی سرفرازی دیکھو۔ اس بے جوڑ عطا کا مطلب بغیر سمجھائے سمجھنا میرے لئے دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔"

اس واقعہ کے چند ہی روز بعد سے ہمارے علیگڈھ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔
گھر میں کیا کیا انتظامات ہوئے اس کا علم تو اللہ کو ہے۔ ہاں باہر جو کچھ لاؤ لشکر جمع کیا گیا اسکا حال سُن لیجئے۔ ایک روز شام کے چار بجے کے قریب چھوٹے صاحبزادے صاحب محلسرا سے باہر تشریف لائے۔ نواب صاحب نے فرمایا "بادشاہ۔ تو اب تم جو چیزیں ساتھ لے جانا چاہتے ہو وہ چھانٹ لو۔ ماسٹر صاحب بھی موجود ہیں۔ یہ بھی اس انتخاب میں مدد دینگے۔" سب سے پہلے گاڑی گھوڑوں کا انتخاب شروع ہوا۔ پڑھنے جا رہے تھے۔ پھر بھی نواب کے بیٹے تھے۔ اللہ کے فضل سے چار گاڑیاں اور چھ گھوڑے پسند کیئے۔ اس کے بعد ملازمین کے چھانٹنے کی باری آئی۔ چار خدمتگار دو پاؤں دبانے والے۔ ایک کہانی کہنے والا۔ دو باورچی۔ آٹھ سائیس۔ اسطرح خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی بیس پچیس آدمی منتخب ہوئے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا "جناب والا! یہ صاحبزادے صاحب پڑھنے جا رہے ہیں یا کہانیاں سُننے اور پاؤں دبوانے؟ یہ گاڑیاں۔ گھوڑے استعمال کیلئے جا رہے ہیں یا پروسیشن نکالنے۔؟ بھلا اس لاؤ لشکر کے ساتھ تعلیم کیا خاک ہوگی۔" جن صاحب کا انتخاب اس بھیڑ و بنگاہ کی نگرانی کیلئے ہوا تھا وہ بگڑ کر بولے۔ "ماسٹر صاحب! نواب صاحب کے صاحبزادے تعلیم کے لئے جا رہے ہیں۔ میرے یا آپ کے بچے نہیں جا رہے ہیں۔ کہ ایک صندوق اُٹھایا اور نکل کھڑے ہوئے۔" میں نے کہا "اور ہاں جناب عالی! یہ بھی بتا دیا جائے کہ خیر میں تو صاحبزادے صاحب کا اتالیق بن کر جا رہا ہوں۔ کیا یہ حضرت میرے اتالیق ہو کر تشریف لیجا رہے ہیں۔"؟ ان کے لئے تو میرا ایک ہی فقرہ کافی تھا۔ بیچارے خاموش ہو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ طوطی کی آواز نقار خانہ میں کوئی نہیں سُنتا تو میں بھی لاحول پڑھکر خاموش ہو گیا۔

اس واقعہ کو دو تین روز گزر گئے۔ ایک دن رات کو جب آٹھ بجے کے قریب دربار برخاست
ہونے لگا تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھکر فرمایا " ماسٹر صاحب! آج رات کو ہم سب
چھوٹے میاں کو پہنچانے کے لئے علیگڈھ جا رہے ہیں۔ آپ بھی ڈیڑھ بجے اسٹیشن پر آجائیے"۔ میں نے
عرض کی " عالیجناب! میں نے ابھی تک چلنے کی کوئی تیاری کی ہے اور نہ میں ایسے فوری حکم کیلئے
خود تیار تھا۔ آپ تشریف لیجائیے۔ میں انشاء اللہ دو تین روز بعد پہنچ جاؤنگا" الغرض یہ تصفیہ
ہوا کہ تیسرے روز میں یہاں سے روانہ ہوں۔ اور اس وقت تک نواب صاحب وہیں تشریف فرما رہیں۔
دوسرے روز صبح ہی میں نے روانگی کی تیاریاں شروع کیں۔ شام کو مددگار صاحب سے
ملنے گیا۔ ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب دو تین ہی اسٹیشن گئے تھے کہ نزلہ شروع ہو گیا۔
اور وہ مع مصاحبین واپس تشریف لے آئے۔ مگر صاحبزادے صاحب اور ان کا لشکر آگے
چلا گیا۔ مددگار صاحب سے ملکر میں نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دیکھا خاصے بھلے چنگے ہیں۔
ایک آدھ چھینک آ گئی تھی۔ ڈر ہوا کہ کہیں نمونیا نہ ہو جائے اسلیئے واپس تشریف لے آئے۔
دوسرے دن پھر گیا تو نواب صاحب نے ایک تار میرے ہاتھ میں دیا۔ صاحبزادے صاحب کا
تار تھا۔ لکھا تھا کہ "کالج والوں نے تمام ملازمین اور گاڑی گھوڑوں کو بورڈنگ میں رکھنے سے
انکار کر دیا ہے۔ اور ہدایت کی ہے کہ اگر اس کالج میں رہنا ہے تو صرف ایک اتالیق اور ایک
نوکر کے ساتھ آ کر رہو۔ ورنہ کوئی دوسرا کالج تلاش کرو" اس تار نے تمام مصاحبین میں ایک
جوش پھیلا دیا۔ کوئی کہتا تھا " خداوند نعمت! یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ بھلا یہ کیا جانیں۔ کہ
نوابوں کے لڑکے کسطرح رہتے ہیں؟ اور کسطرح تعلیم پاتے ہیں؟ یہ تو گدھے گھوڑے دونوں کو
ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ خدا کے واسطے صاحبزادے صاحب کو بلوا لیجئے ایسا نہ ہو کہیں انکے
دشمن بیمار پڑ جائیں"۔ میں نے کہا " میر صاحب! جب نوابی ہی کرنی ہے تو پڑھانے سے فائدہ؟
نواب بنکر نہیں پڑھا جاتا۔ طالبعلم بنکر پڑھا جاتا ہے۔ صاحبزادے صاحب کو اگر نواب صاحب
بالکل میرے سپرد کر دیں تو میں دو ہی برس میں دکھا دوں کہ کیا سے کیا ہو گیا" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ
دوسرا تار آیا۔ لکھا تھا " میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ واپسی کی اجازت دی جائے" میں نے بہتیرا
سر مارا مگر میری ایک نہ چلی اور تار دیدیا گیا کہ " فوراً چلے آؤ" جب طالب علم ہی نہ رہا تو اتالیق کیسا۔

میں نواب صاحب کو اُس روز جو آخری سلام کر کے آیا تو وہ دِن اور آج کا دِن پھر کبھی نہیں گیا مُدتیں گزر گئیں۔ بھول گئے ہونگے۔ مگر مجھے پُرانی اور نئی تہذیب کی یہ ٹکر ہمیشہ یاد رہیگی۔

تم ہمیں بُھول گئے ہو صاحب،
ہم تمھیں یاد کیا کرتے ہیں

مُردہ بدست زندہ

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہرداری نے لیلی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دِل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دُنیا داری ہی دنیا داری رہگئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مرگیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مرجائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مرگیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسماً رہگیا ہے۔ صرف اسلیئے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ۔ جیتے جی تو دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مرگیا۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے میرے ساتھ آیئے آج کل کی میتّوں کا رنگ بھی دکھادوں۔

یہ لیجئے۔ سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سیکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں۔ امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں ملکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے "کیا مرگئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے"۔ اتنا کہا اور اپنی جیب سی سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہوچکا۔ اب دُنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت

کیجئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازہ کے سامنے کی بھیڑ چھنٹ گئی۔ کچھ ادھر ہو گئے۔ کچھ ادھر۔ آگے آگے جنازہ ہے اسکے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے ہونگے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی۔ اور چپ چاپ اسطرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ جنکو پیچھے رہنا تھا اُنھوں نے چال آہستہ کر دی۔ جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہی جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیئے اجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں۔ یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ھٹتا ھٹاتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرضمندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا۔ جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیئے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں۔ اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں۔ اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انھوں نے بھی وہی دُنیا بھر کے قصّے شروع کیئے۔ غرض اسطرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھینگے۔ دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو۔ کپڑے بدل۔ خاص اسی نماز جنازہ کے لیئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں۔ یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھینگے۔ دُور سے مسجد کو دیکھا اور انھوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ ملگئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے۔ اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انھوں نے وقت گزار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونیکی اطلاع فوراً ملجائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی اور ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازہ کی طرف بڑھے۔ آدھر جنازہ نکلا اِدھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھکر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کی سُنیئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف

دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ
تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ آئے۔ مرنے والے کا نام پوچھا۔ مرض
دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات وممات ان ہی کے تفویض کر د
ہے۔ اور یہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں
موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھیں کے لئے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک
سے گزرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے
کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مگر ان کے پٹرول کا نقصان کرے
شوفر ہے کہ ہارن پہ ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ ادھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ
ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے۔ مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آ رہی ہے اسی رفتار سے
نکلیگی۔ اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئیگی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے
ہٹانے کی فکر کرینگے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے۔ کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت
بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے۔ خاصہ ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے
اس میں ایک سقے صاحب اُنکی بیوی۔ دس بارہ بچے۔ پانچ چھ بکریاں۔ ایک لنگڑا ٹٹو۔ سو
دو سو مرغیاں۔ پانچ چھ بلیاں۔ اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں
ہیں وہاں کی گھانس بڑھکر کمر کمر ہوگئی ہے۔ دیواریں توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لئے ہیں۔ نیم پیپل
اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر
دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا تعویذ ہی غائب ہے۔ کسی چبوترہ کی اینٹیں نکلکر جھونپڑی میں
خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصہ
جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسیقدر صاف ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ پہلے حصہ کا مُردوں سے تعلق ہے
اور دوسرے کا زندوں سے۔ مُردے تو اپنی قبروں کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے۔ انکے
جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے۔ جنگلی زمین ہے وہ تو روپیہ
کھڑے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصہ کا صاف رکھا جانا اُصول تجارت پر

بنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کیلئے دوکاندار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے۔ تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو۔ پھر تم جانو اور تمہارے مُردے جانیں۔

یہاں سقہ رہتے تو قبرستان میں ہیں۔ مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور اُدھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لیجا کر پھر قبر پر چڑھا دیئے۔ خیر کیا ہرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا۔ مُردے بھی خوش ہو گئے۔ اس گھر میں سِل بٹا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اُکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مُرغیاں کچی قبروں کو کُریدرہی ہیں۔ بچے یا تو چبوترے پر لوٹ مار رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بیچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے آسیرنی سقنی نے گیہوں سُکھانے ڈال دیئے ہیں۔ ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھانس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے ادھر اُدھر کھُدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری۔ کسی کا چُونہ گرا۔ کسی کا پتھر گرا۔ اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیئے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑہ کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا۔ نوج میں ترنم بجگیا۔ سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ۔ جھونپڑی میں گھُسا۔ اور اناج لینے کو برتن لے۔ لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پیندی کا نام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی ہوئی رکابی۔ کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سُنیے۔ جنازہ لا کر لبِ گور رکھدیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سُست کہتا ہے۔ کوئی ٹپاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی

ایک ایک قبر پر جا بیٹھے چبوترہ کو تخت بنایا۔ اور تعویذ کو گاؤ تکیہ۔ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے کر پیئے جا رہے ہیں۔ ایک دوسری کی تواضع کی جا رہی ہے۔ سلفہ پر سلفہ بھروایا جاتا ہے۔ اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد ہی کریں۔ یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھکر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض صاحب ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے۔ قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کیلئے کیوں آ نیلگے۔ آج شرماشرمی قبرستان میں آ گئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھے لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مریگا تو پھر دیکھا جائیگا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ ملگیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دیکر بلا لیا۔ اور بجائے فاتحہ پڑھنے کے داد سخن گوئی دیگئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا۔ کچھ اُن کا سُنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنیکو نکال ہی لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں۔ اُن کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے۔ اور ہر قبر کانگریس کا اجلاس۔ دُنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور اُن کی تصدیق و تردید کیجا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ وعدے لیئے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیئے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اُٹھکر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اُتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میّت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے مُٹھے کے سرے پکڑ کر میّت کو اُٹھایا۔ آٹھ دس نے غُل مچایا " سنبھال کے سنبھال کے۔ میّت بھاری ہے۔ کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں

اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ ۔ ہے آہستہ سے " اب میت قبر کے منہ تک آگئی ۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا۔ اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے " ذرا کمر کی چادر کو کھینچو ۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے دیکھنا کہیں قبر کا پاکھانہ گرے ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ ذرا اور جھکا کر ۔ لا الہ الا اللہ۔ میت بھاری ہے ۔ ذرا سنبھال کے ۔ آہستہ آہستہ ۔ بس بھئی بس " کوئی چیخ رہا ہے " مٹھے کے بندھن کھول دو۔ اے میاں ۔ تو ۔ یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھکر منہ قبلہ کیطرف کو کردو۔ واہ بھئی واہ ۔ اتنا بھی نہیں آتا ۔ ابھی منہ پورا نہیں پھرا ۔ بس بھئی بس "

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے ۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے ۔ جو بیچارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں ۔ بہرحال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست و احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں ۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے ۔ اسمیں بھی وہی گڑ بڑ شروع ہوتی ہے ۔ کوئی کہتا ہے " یہ کڑی نہیں ۔ وہ کڑی لو " کوئی کہتا ہے " لاحول ولا قوۃ ۔ مفت میں سو روپیے مار لئے ۔ اور کڑیاں دیں تو ایسی " غرض کوئی کچھ کہتا ہے ۔ کوئی کچھ ۔ اور اسی گڑ بڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے ۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے ۔ منھ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیئے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں ۔ البتہ لفظ " منہا " بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منھ ہی منھ میں ختم کر دیئے جاتے ہیں ۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آئی ۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو ۔ ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہونگے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا صورتیں پڑھتے ہیں ۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی ۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں ۔ اور ان کی کیا حالت ہے ۔ ہاں ان بیچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور ۔ گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں ۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ " فاصلہ بہت تھا " کبھی کہتے ہیں کہ " آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں ۔ وہاں آپ کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا ۔ بہرحال ان مصیبت زدوں کو

دق کرکے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔
دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی ہیئت کا رنگ۔ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں۔؟ اب سوا اس کے کیا ہے کہ خدا سے دعا کیجائے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں درد پیدا کرے۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کر رہے ہیں۔

غُلام

حدا بہتر جانتا ہے کہ مجھکو کس غرض کی تکمیل اور کس خیال کو پیش نظر رکھکر پیدا کیا گیا ہی؟ مجھے تو بظاہر اپنے یہاں آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں اگر سرکار کے جانٹوں کے لیئے کسی گدّی کی۔ بیگم صاحبہ کے طمانچوں کے لیئے کسی گالّہ کی۔ صاحبزادے صاحب کی ٹھوکر کیلیے کسی پنڈلی کی۔ اور صاحبزادی صاحبہ کی چٹکیوں کے لیئے کسی بانھ کی ضرورت تھی تو یقیناً میرے پیدا کرنے کے بہت کافی وجوہ موجود تھے۔ اور شاید اسی خیال سے میری ہڈیاں مضبوط۔ میرا گوشت سخت۔ اور میری گدّی چوڑی بنائی گئی ہے یا رفتہ رفتہ بن گئی ہے۔

میں کہاں پیدا ہوا؟ اور کب پیدا ہوا؟ اسکا داخلہ قضا و قدر کے دفتر میں شاید مل سکے تو مل سکے۔ دنیا میں ان واقعات کا پتہ چلنا ناممکن ہے۔ میرے ماں باپ کون تھے؟ اس کا حال بھی کسی کو معلوم نہیں۔ اور کیونکر معلوم ہو سکتا ہے۔ جب باوجود اُن کا بیٹا ہونے کے مجھے خود معلوم نہیں۔ تو بھلا دوسروں کو کیا معلوم ہوگا؟ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جب میں بہت چھوٹا سا تھا۔ اُسوقت ایک عورت مجھے گود میں لیئے پھرتی تھی۔ اس کے بعد وہ غائب ہوگئی۔ اور کسی نے مجھے سڑک کے کنارے ایک مکان میں لا بٹھایا۔ ہمارے سرکار آئے۔ کچھ لکھا پڑھی ہوئی۔ مجھے گاڑی میں بٹھاکر گھر لائے اس کے بعد اتبک نہ یہ گھر ہم سے چھوٹا اور نہ ہم اس گھر سے چھوٹے۔

گھر میں آتے ہی ماروں مار میرے لیئے نئے کپڑے سلے اور نہلا۔ دھُلا۔ کپڑے پہنا مجھے خاصہ بھلا آدمی بنا دیا۔ تھوڑی دیر میں دستر خوان بچھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے بھی دستر خوان پر

بٹھالیا۔ یہ پہلا اور آخری دن تھا جو اس گھر میں مجھے دسترخوان پر کھانا کھانا نصیب ہوا۔ کھانے بڑے مزے کے تھے۔ میں بھوکا بھی تھا۔ ایسا بیتاب ہوکر گرا۔ کہ جب پیٹ تن کر نقارہ ہوگیا اُسوقت کہیں جاکر کھانے سے ہاتھ اُٹھایا۔ جس پیٹ میں کبھی آدھی روٹی نہیں پہونچی تھی اُس میں اتنا ملغوبہ بھر گیا۔ بدہضمی ہوئی۔ علاج ہوئے۔ خدا خدا کر کے اچھا ہوا۔ اس کے بعد میں کھانے میں احتیاط کرتا یا نہ کرتا۔ ہاں کھانا دینے میں بیگم صاحبہ بہت احتیاط کرتیں۔ گھٹتے گھٹتے آدھی روٹی پر نوبت آگئی۔ حکم تھا کہ "میرے سامنے کھائے" بھلا بڑھتے معدہ کو آدھی روٹی کیا معلوم ہو۔ لیکن وہاں آدھی روٹی سے پون روٹی نہ ہوئی۔ اسپر بھی ماماؤں کی طعنوں کی بوچھاڑ سے کلیجہ چھلنی کر ڈالتیں کہ "اے بوا دیکھنا! اسکی عمر دیکھو۔ اور اس کا کھانا دیکھو! ذرا بڑا ہوا تو پانچ سیر آٹا چٹ کر جائیگا" ہوتے ہوتے بیگم صاحبہ نے بھی یہی سبق پڑھنا شروع کر دیا۔ خود ایک وقت میں آدھی روٹی دیتی تھیں۔ پھر بھی میرے بڑے پیٹے ہونے کی شکایت تھی۔ ان کی ایک لڑکی بس میرے ہی برابر تھی۔ یقین مانیئے گا کہ ہر وقت اُس کا منھ چلتا تھا۔ یہ سودے والا آیا۔ مچل گئی۔ دو پیسے لے۔ کھا گئی۔ کوئی خوانچہ والا آیا۔ بپھر گئی۔ ایک آنہ لے چٹ کر گئی۔ کاچھن آئی۔ لوٹ گئی۔ دو چار پیسے کے کچالو ہضم کیئے۔ کھانے پر بیٹھی تو سب کے بعد اُٹھی۔ جب دیکھو پیٹ تنا ہوا ہے۔ دست آرہے ہیں۔ مگر بیگم صاحبہ ہیں کہ یہی کہے جاتی ہیں کہ "اے ہے یہ بچی نہ کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ آخر کیسے جیئے گی؟ ذرا کچھ کھانے بیٹھی اور اِس موے (یہ میری طرف اشارہ تھا) نے گھورنا شروع کر دیا۔ جیسے کا ویسا نکل گیا۔ جب سے یہ آیا ہے میری بچی کی تو بھوک مر گئی ہے۔ بھر بھر کا بیاں دیتی ہوں جب بھی تو موے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ مرغی کا معدہ ہے ادھر کھایا اور اُدھر ہضم"

نظر وظر لگانا تو مجھے آتا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ گھورنا اکثر میرے لیئے مفید ثابت ہوا ہے۔ شروع شروع میں تو میری یہ حالت تھی کہ کسیکو کچھ کھاتے دیکھا۔ اور الگ ہٹ گیا۔ لیکن کوئی اللہ کا بندہ یہ بھی خیال نہیں کرتا تھا کہ اس معصوم اور لاوارث بچے کو کچھ دے دو۔ آخر کہاں تک دل مارا جاتا میں نے بھی رنگ بدلا۔ جہاں کسی نے ذرا منھ چلایا۔ اور میں نے گھورا۔ ادھر میں نے گھورا اور اُدھر جھپیر صلواتیں پڑنی شروع ہوئیں۔ مگر تھوڑا بہت یاروں کے حصہ میں آہی گیا۔ ہوتے ہوتے میری نظر کا شہرہ ہوگیا۔ ایک دفعہ میں نے بہت گھورا تھا۔ مگر کسی نے مجھکو کچھ نہیں دیا تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ کسی کا سارا کھایا پیا جوں کا توں نکل گیا۔ اور میری نظر لگنے کا اثر سمجھا گیا۔ اب کیا تھا ذرا میں نے کھانے والے کی

طرف گھور کر دیکھا۔ اور میں اُس کا حصہ دار ہو گیا۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ دُنیا کی کوئی نعمت نہ تھی جو گھر میں آئی ہو۔ اور اُسمیں تھوڑا بہت مجھے نہ مل جاتا ہو۔

ہمارے سونے کی شان بھی عجیب شان تھی۔ دوسروں کے پاس بچھونے تھے۔ ہمارے پاس بھی تھے۔ مگر رضائی تو ایسی تھی کہ اُس میں سے آسمان دکھائی دے۔ اور تکیہ ایسا کالا تھا۔ کہ اُس پر میل پڑ ہنے یا گھٹنے کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ میری رنگت اور بالوں کی سیاھی میں کچھ اُنیس بیس ہی کا فرق ہو گا۔ مگر میرے بالوں اور تکیہ کی سیاھی میں اُنیس بیس نہیں۔ پندرہ اور بیس کا فرق تھا۔ ساتھ ہی چپچپاہٹ ایسی تھی کہ سر کے ساتھ زمین سے اُٹھ آتا تھا۔ اب رہی دری تو وہ کسی زمانہ میں دری کی تعریف میں آتی ہو تو آتی ہو۔ میرے زمانہ استعمال میں بچھنے کے بعد زمین میں اور اس میں تمیز کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر بچھونے سے ہم کو واسطہ بھی کم پڑتا تھا۔ ادہر آنکھ لگی اور ہم کروٹ لے زمین پر آ رہے۔ تکیہ ایکطرف گیا۔ دری ایک طرف گئی۔ اب رہی رضائی تو اُس کا بچھونے سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہم نے خدا کی دی ہوئی زمین پر لوٹ ماری اور گھر کے "کُتے" نے ہمارا بچھونا سنبھالا۔ سردی لگی تو سوتے ہی سوتے میں کتے کی اور ہماری دری پر جنگ ہو گئی۔ کبھی ہم نے کُتے کو دری سے ہٹا دیا اور کبھی "کُتے" نے ہم کو ڈھکیل کر بچھونے پر قبضہ کر لیا۔ ادہر صبح ہوئی اور اُدہر بیگم صاحبہ یا کسی ماما نے اُٹھ کر ٹھکو ٹھوکر کے ذریعہ سے ہوشیار کر دیا۔ ہم پہلے تو ذرا کسمسائے مگر دوسری یا تیسری ٹھوکر نے آنکھیں کھول ہی دیں۔ اُٹھکر بچھونے کو لپیٹا۔ ایک کونہ میں رکھا۔ نل پر جا کر دو ایک چُلّو سے آنکھیں ٹھوئیں۔ اور "چل بڑھیا جرخہ جا سولی پر رام بھلی کرینگے" پھر وہی ہم ہیں اور وہی ایک بولی اور تین کام۔

خیر کام سے تو ہم نہیں گھبراتے۔ مگر ہر وقت کی مار پیٹ ذرا بُری معلوم ہوتی ہے۔ آخر کوئی کہاں تک پٹتے جائے۔ یہ آیا مار گیا۔ وہ آیا مار گیا۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں "تو مالا" صاحبزادہ صاحب کہہ رہے ہیں "پانی لا" صاحبزادی صاحبہ فرما رہی ہیں "چل میرے ساتھ کھیل" یہ کہہ رہا ہے "ادہر آ" وہ کہہ رہا ہے "ادہر جا" آخر آدمی نہ ہوا "گھن چکر" ہو گیا۔ جس کا حکم نہ مانو وہی مارے۔ اور حکم مانو تو کیونکر مانو۔ بھلا تین کام ایک آدمی کیونکر کرے؟ میں نے بھی بے حیائی کا جامہ پہن لیا۔ پٹنا قسمت میں لکھا ہے تو یوں ہی سہی۔ یوں بھی پٹنا۔ ووں بھی پٹنا۔ پھر کام کر کے اپنے آپ کو مفت میں کیوں تھکائیں۔ نکمے کا خطاب ملا تو ملنے دو۔ بُرا بھلا کہتے ہیں تو کہنے دو۔ اس کان سُنو۔ اُس کان اُڑا دو۔ آپ ہی بک بک کر

تھک جائیں گے۔ یہ چال بھی گھور نے کی ترکیب کی طرح کارگر ہوئی۔ سب تیخنتے چلاتے مگر میں ٹس سے مس نہ ہوتا۔ جہاں کسی نے ذرا ہاتھ لگایا اور میں نے اس زور سے چیخ ماری گویا کسی نے گلا گھونٹ دیا ہے۔ کبھی کسی نے میری اس ترکیب کو دیکھ لیا تو راز کھل گیا۔ نہیں تو مارنے والا خود گھبرا گیا۔ دوسروں نے غل مچایا کہ "اے ہے لونڈے کو مار ڈالا" کبھی تو مارنے والے صاحب مجھ سے زیادہ پیٹ گئے۔ اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ ہو گئی مگر ہم کام سے بچ گئے۔ تھوڑی دیر چیختے چلاتے رہے ہیں کے بعد یا تو پڑ کر سو گئے یا آنکھ بچا باہر نکل گئے۔ مگر بابا "ہر فرعونے را موسیٰ" چھوٹی صاحبزادی صاحبہ کچھ مجھ سے بھی زیادہ تیز نکلیں خود ہی مجھے مارتیں۔ اور خود ہی رونے بیٹھ جاتیں۔ بھلا ان کے مقابلہ میں مجھ بیچارے کی کیا ہستی تھی۔ اُلٹی مجھ ہی پر لے دے ہوتی۔ غرض اس لڑکی کے ہاتھوں ناک میں دم آ گیا تھا۔ مگر میں بھی بدلہ لئے بغیر تھوڑی مانتا تھا۔ مارنے کی تو ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہاں کبھی بیگم صاحبہ انپر خفا ہوتیں تو میں بھی اُلٹی سیدھی بہت کچھ لگاتا۔ مہینہ مہینہ بھر پہلے کی باتیں یاد دلاتا۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو کام بن گیا اور صاحبزادی صاحبہ کی خوب کُندی ہو گئی۔ نہیں تو اُلٹا اپنے کا الزام لگا۔ بیگم صاحبہ لے بیٹی کا غصہ مجھ غریب پر اُتار لیا۔

ہمارے کپڑوں کی کچھ نہ پوچھو۔ ادھر پہنے اور اُدھر میلے۔ بدن میں کانٹے تھے کہ بنا جوڑا بھی نیفے سے ثابت نہیں اُترتا تھا۔ خیر گریبان تو ہمیشہ چاک رہتا ہی تھا۔ ہاں اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ سینہ کے نمونہ کا گریبان بیٹھ پر بھی بن جاتا تھا۔ اب رہے ہمارے چاک۔ تو ان کا بڑھتے بڑھتے بغل تک آ جانا معمولی بات تھی۔ موٹے سے موٹے لٹھے اور گاڑھے کے کپڑے بنائے گئے۔ مگر کوئی کپڑا بدن سے ثابت نہ اُترنا تھا نہ اُترا۔ پاجامہ پہلے ٹخنوں سے گز کر شرعی ہوا۔ اس کے بعد گھٹنوں تک آیا۔ اور آخر گھٹتے گھٹتے جانگیہ بن گیا۔ اب رہی ٹوپی اور اچکن۔ تو وہ ہمیشہ "فس کلاس" رہتی تھی۔ اور کیوں نہ رہتی۔ پہنتا ہی کون سخر تھا۔ کبھی عید۔ برات کو پہن لی تو پہن لی۔ نہیں تو ٹوپی میں اچکن ٹھنسی ہوئی کمرہ کے کسی کونے میں پڑی رہتی تھی۔

ٹوپی کے ساتھ ہی سر کا بھی خیال آ گیا۔ اس کا حال بھی سُن لیجئے۔ جمعہ کے جمعہ ہماری ٹانٹ گھونٹ کر باجرے کا پیڑا بنا دی جاتی تھی۔ ذرا بالوں کی کھونٹیاں نکلیں اور اُسترا ابھرا۔ اُسترے کا پھرنا قیامت ہوتا تھا۔ جس کے پاس سے نکلے اُسی نے چانٹا رسید کیا۔ کچھ گھٹی ہوئی ٹانٹ پر چانٹا ایسا پڑتا ہے کہ سُبحان اللہ چھینٹیں اُڑ جاتی ہیں۔ مارنے والوں کو مزہ آتا ہو تو آتا ہو میرا تو بعض وقت

سر چھپتا جاتا تھا۔ اور تو اور بڑے سرکار بھی مذاق میں چلتے چلتے دو ایک چانٹے ضرور رسید کر دیا کرتے تھے۔
کہتے ہیں "باپ پر پوت - پتا پر گھوڑا - بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" میرا باپ بھی شاید کوئی
چور تھا۔ کیونکہ جہاں میں نے کسی اچھی چیز کو دیکھا۔ اور چرانے کو جی چاہا۔ پہلے تو دل مارتا رہا۔ آخر فطرت
طبیعت پر غالب آگئی۔ اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی چوری میں نے شروع کر دی۔ کھلونا اُٹھایا، چھپا دیا۔
رومال دیکھا غائب کر دیا۔ لیکن آخر ان چیزوں کو لے کر کہاں جاتا؟ میری دُنیا تو اسی مکان کی چار دیواری تھی۔
سچ ہے خدا بڑا کارساز ہے۔ یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ ایک نئی ماما آئیں۔ ہاتھ کی بڑی تیز تھیں
موقع ملتا تو گھر بھر میں جھاڑو دے دیتیں۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ بیگم صاحبہ کچھ ان کی شکل سے تاڑ گئیں۔ اسلئے
ان کے حدود باورچیخانہ اور صحن سے آگے نہ بڑھے۔ اسپر بھی وہ اپنا پوتھہ پورا کر لیتی تھیں۔ رات کو
گھر جاتیں۔ صبح ہی صبح آتیں۔ دوپہر کا کھانا لیکر جاتیں تو کوئی دو بجے واپس آتیں۔ کوئی روز روز پوٹلی کھلوانے
سے تو رہا۔ خدا معلوم کتنا دال آٹا باندھ کر لے جاتی تھیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب سے وہ آئی تھیں۔
دسترخوان پر ہر چیز نتھر جاتی تھی۔ ہماری بیگم صاحبہ کی سمجھ دیکھو کہ بجائے یہ معلوم کرنے کے کہ کھانا کیوں
کم پڑتا ہے۔ اُلٹا غلہ بڑھا دیا۔ مگر ماما نے اسپر بھی بس نہ کی۔ ادھر غلہ بڑھا اور اُدھر ان کی چوری بڑھی۔
غرض جب تک وہ رہیں کھانے میں ہمیشہ برکت ہی برکت رہی۔ ماماجی بچہ سمجھکر میرے سامنے پوٹلی
باندھنے میں ذرا احتیاط کم کرتی تھیں۔ اسلئے مجھے اُن کے کرتوتوں کا حال خوب معلوم ہے۔ رکابی اور
پیالہ سے لگا چھوٹی پتیلی اور سرپوش تک اُن کی پوٹلی میں ہمارے گھر سے رخصت ہوئے ہیں۔ ان
چیزوں کے جانے کے متعلق جس زمانہ میں کچھ گڑبڑ ہوتی تو بی ماما ذرا ہاتھ روک لیتیں۔ خود پوٹلی سارے
گھر کو دکھا کر جاتیں۔ جہاں ذرا معاملہ ٹھنڈا پڑا۔ اور چیزیں کھسکنی شروع ہوئیں۔ اُن کو معلوم تھا کہ
میں اُن کی ساری کارروائیوں سے واقف ہوں۔ اسلیے میری بڑی خاطرداری کرتیں۔ چھپکے ہی چھپکے
باورچیخانہ میں خوب کھلاتیں۔ کبھی کبھی مٹھائی بھی لاکر دیتیں۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی اُن سے کچھ اُنس
ہوگیا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ گھر والے میرے ساتھ کون سی بھلائی کرتے تھے جو میں اُن کے مال کا غم کھاتا۔
آخر یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں خود میں نے ماما جی کو چُرا چُرا کر چیزیں دینی شروع کیں۔ ذرا بیگم صاحبہ نے
کوئی چیز رکھی اور غائب۔ تکیہ کے نیچے سے پیسے غائب۔ جیب میں سے روپیہ غائب۔ کھونٹی پر سے
تولیہ غائب۔ آخر یہاں تک ہوا کہ پٹاری میں سے سونے کا چھلا اُڑ گیا۔ اسپر بڑا غل مچا۔ چھری پڑ ہوا کر

رکھوائی گئی۔ کچّے چاول چبوائے گئے۔ مگر پتہ نہ چلا۔ مجھپر تو شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جانتے تھے کہ چرائیگا تو کہاں لے جائیگا۔ ماما پر شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کیونکہ ان سے باورچیخانہ کب چھوٹتا تھا اب رہیں بی مُغلانی اور آپا۔ تو وہ جانیں اور بیگم صاحبہ جانیں۔ غرض تھوڑے دن میں گئی گذری بات ہوئی۔ چھلّے کے عوض میں بی ماما نے مجھے دو لڈو لا کر دیئے۔ اب کیا تھا۔ مجھے لڈوؤں کی چاٹ پڑ گئی۔ میں نے بھی اپنا گھر صاف کر ماماجی کا گھر بھرا۔ اور خوب بھرا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہونیوالی تھی۔ سارا جہیز ہمارے گھر سے رفتہ رفتہ وہاں پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ دری۔ چاندنی اور مچھردان تک اُٹھ گیا۔ بیگم صاحبہ پریشان تھیں کہ یا اللہ سامان کے پر لگ گئے ہیں کہ اِدھر رکھا اور اُدھر غائب۔ آخر حاضرات کی ٹھہری۔ چھوٹی بی بی آئینہ کے سامنے بٹھائی گئیں۔ جنوں کے بادشاہ آئے۔ ان سے چور کا حال پوچھا گیا۔ چھوٹی بی بی تو میری جان کی دشمن تھیں ہی۔ انھوں نے میرا نام لے دیا۔ کسی کو یقین نہ آیا۔ مگر پھر بھی سرکار کچھ کھٹک گئے۔ شاید میرے اور ماماجی کے زیادہ میل جول سے اُن کو کوئی خیال پیدا ہو گیا۔ ماماجی سمجھیں کہ چلو یہ مال بھی ہضم ہوا۔ ایک دن مجھ سے کہا "دیکھیو بیٹا! ابھی بیگم صاحبہ پٹاری میں چھپاکلی رکھکر کوٹھے پر گئی ہیں۔ اسوقت دالان میں کوئی ہے بھی نہیں۔ ذرا چپکے سے نکال تو لا۔ ایسے لڈو کھلاؤں گی کہ پیٹ بھر جائیگا۔" ہم باورچیخانہ سے نکل۔ ٹہلتے ٹہلتے دالان میں آئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ پٹاری کھول۔ چھپاکلی نکال۔ نیفہ میں اُڑس۔ باورچیخانہ میں آ۔ ماماجی کے حوالہ کی۔ انھوں نے اپنے خشکہ کی رکابی میں ٹھونس۔ پوٹلی میں باندھ دی۔ بیگم صاحبہ نیچے آئیں۔ پٹاری کھول۔ پان کھایا۔ مگر کچھ نہ بولیں۔ تھوڑے دیر میں بڑے سرکار۔ بی مغلانی اور آپا بھی دالان میں آ گئے۔ کھانا منگوایا گیا۔ سب نے کھا پی فراغت کی۔ بی ماما اپنی پوٹلی دکھا دروازہ کے باہر نکلی ہی تھیں کہ ایک غل مچ گیا۔ میں بھی دوڑتا ہوا باہر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماماجی کو ایک سپاہی پکڑے کھڑا ہے۔ اور بی ماما وہ شور مچا رہی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ گھر والوں کو بھی کوسنے دے رہی ہیں۔ سپاہی کو بھی صلواتیں سنا رہی ہیں۔ مجھے جو ماماجی نے دیکھا تو کہا "بیٹا ذرا یہ کھانا تو لیجا کر میرے گھر میں دے آ۔ بچی بھوکی بیٹھی ہوگی۔ بارہ بج چکے ہیں۔ دیکھیے ان کالی وردی والوں سے کب پیچھا چھٹتا ہے۔ خدا نہ کرے کوئی ایسے گھر میں نوکر ہو۔ یہ نہ شریف کو دیکھیں نہ رذیل کو۔ گھوڑے گدھے کو ایک لاٹھی ہانکتے ہیں۔" یہ کہہ انھوں نے پوٹلی میری طرف بڑھائی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سپاہی نے اس زور سے ڈانٹا کہ میرا تو دم ہی نکل گیا۔

اور ماما جی بھی کچھ سہم سی گئیں۔ اتنے میں دارو غہ جی (سب انسپکٹر پولیس) بھی آ گئے۔ کچھ لوگ اور جمع ہوئے۔ پوٹلی کھلوائی گئی۔ خشکہ میں سے چمپاکلی نکلی۔ یہ دیکھکر ماما جی بپھر گئیں۔ کہنے لگیں "ہیں!! یہ چمپاکلی میرے خشکہ میں کہاں سے آئی۔ بیگم صاحبہ نے خود نکال کر مجھے خشکہ دیا تھا۔ اُنہی نے رکھدی ہوگی۔ ہاں بابا بڑے لوگ ہیں۔ آج خشکہ میں مدعا (چوری کا مال) رکھکر پولیس کے حوالہ کر دیا۔ کل خدا جانے کیا کریں۔ نا۔ بابا۔ نا۔ میں اس گھر میں اب نہیں رہنے کی" یہ کہہ ماما جی جانا چاہتی تھیں کہ سپاہی نے چُٹیا پکڑ گھسیٹ لیا۔ اسپر تو بڑھیا نے وہ اودھم مچایا کہ معاذ اللہ۔ سارا محلہ چیخ چیخ کر اور رو رو کر سر پر اُٹھا لیا۔ اُس وقت تو میں نہیں سمجھا تھا مگر ہاں اب سمجھتا ہوں کہ غُل مچانے سے اُسکا کیا مطلب تھا۔ اُس کا مکان قریب ہی میں تھا۔ یہ اپنی بیٹی کو نوٹس تھا کہ "مال گھر سے نکالدے"۔ وہ بھی اپنی ماں کی بیٹی تھی سمجھ گئی ہوگی کہ اماں پر آفت آئی ہے۔ مال لے کر نکل رہی تھی کہ دوسرے سپاہی نے اس کو پکڑ مال کے ساتھ ماں کے برابر لا کھڑا کیا۔ اس کے بعد ہم سے پُرسش شروع ہوئی۔ مار سے ڈرایا۔ مٹھائی کا لالچ دیا۔ بھلا ہم کو ان ماں بیٹیوں سے کیا دلچسپی تھی۔ مار کے ڈر اور مٹھائی کے لالچ میں سارا قصہ کہہ سُنایا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ وہ دونوں کہاں جہنم رسید ہوئیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم سے جو وعدے ہوئے تھے اُن میں کا پہلا حصہ بہت دل بھر کر ہم کو پہنچا دیا گیا۔ گھر میں اب بھی ہم رہتے ہیں لیکن ماماؤں اور نوکروں سے ہم کو ذرا کم ملنے دیا جاتا ہے۔ اور پھر بھی اب ہم خود بھی سمجھدار ہو گئے ہیں۔ اگر کچھ چُراتے بھی ہیں تو خود ہی کھا پی کر برابر کر دیتے ہیں کسی کو دیتے دلاتے نہیں۔ بھلا سرکار کے مال کے جب ہم حقدار موجود ہیں تو پھر یہ مال دوسروں کو کیوں پہنچے۔ بچپنا تھا۔ غلطی ہو گئی۔ اللہ معاف کریگا۔

آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے ہم ہندوستانیوں کا کہ خدا کی اس نعمت کی کبھی قدر نہیں کرتے۔ سمجھتے ہیں کہ مفت کا مال ہے جسطرح جی چاہے کام میں لاؤ۔ رات کو پڑھو۔

دن کو پڑھو۔ صبح کو پڑھو۔ شام کو پڑھو۔ یا تو ان سے اتنا کام لو کہ بیکار ہو جائیں۔ یا اسطرح چھوڑ دو کہ یہ خود نکمی ہو جائیں۔ دوسروں کو کیا کہوں۔ خود میں نے ان کو تباہ کر لیا۔ جب دیکھو کتاب ہاتھ میں ہے۔ روشنی ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ اندھیرا ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ کتاب ہے اور میں ہوں۔ آنکھیں آخر کہاں تک کام دیتیں۔ کمزور ہونی شروع ہوئیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھا۔ پھر آنکھیں دبا دبا کر پڑھا۔ آنسو آ گئے پونچھ لیئے۔ ذرا دھندلا دکھائی دیا۔ دھوڈالا۔ غرض جب ساری ترکیبیں ختم ہو گئیں۔ اور کتاب کے حرف نگاہ کے سامنے سے بھاگنے لگے۔ سامنے بھنگے سے اڑنے لگے اُسوقت خیال آیا کہ آنکھیں گئیں۔ اور گئی نہیں تو کمزور ضرور ہو گئیں۔ اب علاج کی سوجھی۔ سب نے کہا کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ دوستوں سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے مدراس جانے کی رائے دی۔ بستر باندھ سیدھا مدراس پہنچا۔ آنکھوں کے مریضوں کا جو دواخانہ ہے اُسمیں جاکر معائنہ کرایا۔ فیسیں بھریں۔ تین چار روز تک دیکھنے کے بعد ڈاکٹروں نے کہدیا کہ "ہندوستان میں علاج نہیں ہو سکتا۔ جرمنی جاؤ۔" واپس آیا۔ پھر مشورے ہوئے۔ سب نے کہا کہ "میاں جاؤ۔ آنکھوں سے زیادہ کہیں روپیہ ہے۔" مرتا کیا نہ کرتا۔ بنک کا حساب دیکھا۔ ٹکٹ کا انتظام کیا۔ چلنے کی تیاری کی۔ یار دوستوں سے رخصت ہونے گیا ایک صاحب نے کہا "اجی حضرت! کیوں روپیہ تباہ کرتے ہو۔ اگر ولایت جانیکا شوق ہے تو خیر اسی بہانہ سے جاؤ۔ ہاں اگر بال بچوں کے لیئے کچھ چھوڑ مرنا ہے تو یہیں علاج کراؤ۔ ولایت والوں میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے۔ ہم لوگ خود اپنے ہندوستانی بھائیوں کو ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ ورنہ جو وہ کر سکتے ہیں وہ ہم کر سکتے ہیں۔ ہاں وہ غیر سمجھکر لوٹتے ہیں۔ ہم اپنا سمجھکر ہمدردی کرتے ہیں۔ لو مجھے ہی دیکھلو۔ میری آنکھوں میں کیا رہا تھا۔ میں نے تو فرانس گیا نہ جرمنی۔ یہیں علاج کیا اور اچھا ہو گیا۔ اگر روپیے سے دشمنی نہیں ہے تو بھائی صاحب بمبئی جایئے۔ ڈاکٹر ڈگن سے ملیئے۔ ہاں وہ جواب دیدیں تو آپ کو اختیار ہے۔ کچھ بات تو ہی جو انگلستان کے ماہران فن چشم نے اُسکو اپنی کانفرنس کا صدر نشین بنایا تھا۔ ہمارا کام سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ اب تم جانو۔ تمھارا کام جانے۔ مانو یا نہ مانو۔" میں نے بھی سوچا کہ ہاں بچارا سچ تو کہتا ہی لاؤ ڈاکٹر ڈگن کو بھی دیکھ لیں کہ کتنے پانی میں ہیں۔ گھر آیا۔ صبح ہی بستر باندھ ریل پر سوار ہو گیا۔ میں بچارا ہندوستانی آدمی۔ سامان بھی کچھ واجبی ہی واجبی ساتھ تھا۔ لباس کے ساتھ پاندان اور لوٹا

صاف ظاہر کرتا تھا کہ اول نمبر کا قدامت پرست آدمی ہے۔ انگریزی جانتا ہوں۔ انگریزوں کے ساتھ مدتوں رہا ہوں۔ انگریزی کپڑے بھی پہنتا تھا۔ مگر وہ زمانہ گیا۔ اب تو کچھ اپنے ہی ملک کے لباس میں آرام آتا ہے۔ سکنڈ کلاس میں بیٹھ۔ ٹوپی اُتاری۔ شیروانی اُتاری۔ جوتہ اُتارا۔ جرابیں اُتاریں۔ بچھونا بچھایا۔ پاندان کھول کر پان کھایا۔ بچھونے پر لیٹ تکیئے گھٹنوں میں دبا آرام سے لوٹ ماری۔

اس زمانہ میں بعض ایڈیٹروں کے تقاضہ نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا مضمون لکھوں۔ پنسل اور کاغذ سرھانے رکھ لیا تھا۔ کہ کچھ سوجھ جائیگا تو لکھ لونگا۔ مگر گاڑی کے چکروں میں کچھ ایسا مزہ آیا کہ آنکھ لگ گئی۔ نیند تو ایسی مزے کی آئی تھی کہ شاید بمبئی ہی میں جاکر آنکھ کھلتی۔ مگر کیا کروں ایک صاحب بہادر کی کرخت آواز نے نیند میں خلل ڈال دیا۔ آنکھیں تو میں نے نہیں کھولیں۔ ہاں ذرا نیچی نیچی آنکھوں سے گاڑی کا رنگ دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک سیاہ فام جوان سے آدمی۔ نہایت عمدہ سوٹ پہنے۔ منہ میں سگار دبائے قلیوں سے انگریزی لہجے کی اردو میں لڑ رہے ہیں۔ لڑائی ایک ٹین کے لوٹہ پر تھی۔ قلی کہتے تھے کہ "حضور کا ہے۔" صاحب کہتے تھے "ہمارا نہیں ہو نا سکتا۔" قلیوں کو شاید یہ ڈر تھا کہ چوری کا الزام نہ لگ جائے۔ ورنہ اُن کو جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ لوٹہ اُٹھا کر چلتے بنتے۔ گھر میں کام آتا۔ میں سمجھ گیا کہ ان ہمارے ہندوستانی بھائی کو انگریزیت کا نیا شوق چرایا ہے۔ گھر سے لوٹہ ساتھ کر دیا ہوگا۔ یہاں سوٹ پہن کر لوٹہ ساتھ رکھتے شرم آتی ہے اس لیئے اسکی ملکیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ گھڑی گھڑی ان کا ہاتھ مونچھوں پر جاتا اور خالی آتا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ مونچھیں پہلی دفعہ منڈائی گئی ہیں۔ رہ رہ کر ٹائی درست کرتے۔ کوٹ اور واسکوٹ کی سلوٹیں نکالتے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ سوٹ پہننے کی عادت نہیں ہے۔ ہاتھ میں موٹی سی انگریزی آداب مجلس کی کتاب تھی۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ عالم ہوکر یہ کہیں اسپرٹل کرنے جا رہے ہیں۔ بکسوں کی زیادتی بتا رہی تھی کہ سفر کے عادی نہیں۔ اس لیئے بضرورت سامان سمیٹ لائے ہیں۔ ان خیالات کا دل میں آنا تھا کہ میں جھٹ اُٹھ بیٹھا۔ سوچا کہ چلو اللہ نے مفت کا ایک مضمون دیا۔ خدا کرے کچھ عرصہ ساتھ رہے۔ مزا آجائیگا۔ سب سے پہلے تو میں نے قلیوں کو سمجھایا کہ "بیوقوفو! کہیں صاحب لوگوں کے پاس لوٹہ ہوتا ہے جو

ان کے پاس ہوگا۔ چلو ہٹو۔ لوٹ پولیس میں دیدو۔ کوئی دوسرا مسافر چھوڑ گیا ہوگا۔" صاحب یہ سُنکر
مُسکرائے اور "تھینک یو" سے میری عقل رسا کی داد دی۔ اس کے بعد نہایت فراخدلی سے
قُلیوں کو انعام دیا۔ بے ترتیب سامان کو بلاوجہ ٹٹول ٹٹول کر اور بے ترتیب کر دیا۔ بندھا ہوا بستر
ایک سیٹ پر رکھا۔ اُس سے تکیہ لگا کر بیٹھے۔ اور اپنی کتاب "آداب مجلس" پڑھنے میں مشغول
ہو گئے۔ میں نے پھر لمبی تانی۔ لیکن کن انکھیوں سے ان کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی کبھی کبھی میری طرف
دیکھ لیا کرتے تھے کہ سو گیا یا جاگتا ہے۔ میں پہلے سے ان کو دھوکا دینے کے لئے تیار تھا کہ انکا اصلی
رنگ دیکھوں۔ آہستہ آہستہ خراٹے لینے شروع کیئے۔ وہ سمجھے کہ چلو یہ تو سو گیا۔ اب اپنا کام کرو۔
چپکے سے ٹفن باسکٹ کھولا۔ چھری۔ کانٹے اور چمچے نکالے۔ کتاب کو دیکھکر اُسی موافق سامنے
جمائے۔ اب تھوڑی دیر کتاب پڑھتے اور تھوڑی دیر خالی چھری۔ کانٹے چلاتے۔ کبھی کبھی ایکٹروں کی
طرح شکریہ کے طور پر ادھر اُدھر گردن بھی جھکاتے۔ غرض اسیطرح کوئی دو گھنٹے گزار دیئے۔ میں نے
کروٹ لی اور اُنھوں نے آہستہ سے سب سامان ٹفن باسکٹ میں رکھدیا۔ اسٹیشن آیا۔ گارڈ نے
کھانے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کھانے کے ٹکٹ کے روپئے دیدیئے۔ انھوں نے صاحب
بہادر سے بھی دریافت کیا۔ پہلے تو اُنھوں نے دماغ پر زور ڈالا کہ سبق پر عمل شروع کروں یا نہ
کروں۔ پھر شاید خیال آیا کہ کہیں اوروں کے سامنے ہتک نہ ہو جائے۔ نہایت ڈانٹ کر "نو"
(نہیں) کہدیا۔ گارڈ نے مجھے لا کر ٹکٹ دیدیا۔ اور ہمارے دوست اپنی کتاب کے سر رہے۔
میں اُٹھا۔ ہاتھ مُنھ دھویا۔ کپڑے پہنے۔ ذرا بھلا آدمی بنا۔ پان کھایا۔ صاحب سے انگریزی
میں پوچھا "آپ تو پان نہ کھاتے ہونگے۔" کہا "نہیں۔ اس سے دانت خراب ہوتے ہیں۔"
میں نے پوچھا "شاید ولایت کا قصد ہے؟" کہنے لگے "نہیں۔ اسوقت تو صرف بمبئی تک جا رہا ہوں۔"
میں نے کہا "بمبئی میں کچھ عرصہ تک قیام رہیگا؟" فرمایا "نہیں۔ صرف چار دن۔" اس کے بعد ذرا
کھلے۔ اور خود سوال شروع کیے۔ پہلا ہی سوال مطلب کا تھا۔ کہنے لگے "بمبئی بہت بری جگہ
ہے۔ کھانا اچھا نہیں ملتا۔ کوئی ہوٹل اچھا نہیں ہے۔" میں نے کہا "یہ تو نہ فرمائیے۔ تاج محل ہوٹل
کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں آرام نہیں ملتا۔ یا کھانا اچھا نہیں ملتا۔ ہاں خرچ ضرور زیادہ ہوتا
ہے۔" کہنے لگے "اوہ۔ خرچ کی پرواہ نہیں۔ ہم اینگلو انڈینز کو پسند نہیں کرتے۔ ہم ایسی جگہ

ٹھہرنا چاہتے ہیں جہاں سب ہندوستانی ہوں۔ یا سب یوروپین" بھلا ایسا موقعہ ملے اور میں ہاتھ سے جانے دوں۔ میں نے کہا " بمبئی ہوٹل میں ٹھہریئے۔ وہاں آپکو آرام بھی ملیگا اور اینگلو انڈینز بھی نظر آئینگے۔ میرا مطلب دوسرا ہی تھا۔ میں خود اسی ہوٹل میں ٹھہر رہا تھا۔ سمجھا کہ یہ شیر ساتھ رہا تو میرا مضمون پورا ہوجائیگا۔ وہ بھلا اس ہیرے کو کیا سمجھتے۔ جھٹ راضی ہوگئے۔ پھر میری ذات کے متعلق انھوں نے سوالات کی بھرمار شروع کی " کیا نام ہے؟ کہاں پڑھا ہے؟ کہاں تک پڑھا ہے؟ کہاں نوکر ہو؟ کیا تنخواہ ملتی ہے؟ کتنے بچے ہیں؟ کیوں بمبئی جارہے ہو؟ کب تک رہوگے؟ کب واپس آؤگے؟ انگریزوں میں رہنے سہنے کا اتفاق ہوا ہے؟ انگریزی آداب مجلس سے واقف ہو؟ تم خود کس ہوٹل میں ٹھہروگے؟" غرض ہزاروں سوال کر ڈالے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ باوجود ہندوستانی لباس کے میں انگریزی طرز معاشرت سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ اور بمبئی ہوٹل میں ٹھہر رہا ہوں۔ تو ان کے چہرہ پر ذرا بشاشت سی آگئی۔ سمجھے ہونگے کہ چلو کتاب کے مضمون پر عمل کرنے میں کچھ تو اس سے مدد ملیگی۔

دوسرے اسٹیشن پر میں تو اتر کھانا کھانے چلا گیا۔ اور ہمارے صاحب بہادر نے اسٹیشن پر سے پوریاں اور مٹھائی خریدی۔ اور خوب تن تازہ ہو۔ شب خوابی کے کپڑے پہن۔ بستر بچھا۔ روشنی گل کر۔ سو گئے۔ ان کا بھانڈہ نہ پھوٹتا اگر حمام میں ترکاری اور مٹھائی کے پتے پڑے ہوئے مجھے نہ ملتے۔ "پتے" دیکھکر میں نے دو نتیجے نکالے۔ اول یہ کہ انھوں نے جو کچھ بھی کھایا۔ حمّام میں کھایا تاکہ کوئی یہ دیکھکر تعجب نہ کرے کہ ایک صاحب بہادر بیٹھے پوریاں کھا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گھبراہٹ میں یا تو یہ "پتے" باہر پھینکنے بھول گئے۔ یا انھوں نے پھینکے تھے۔ اور وہ ہوا کے زور سے پھر الٹے اندر گھس آئے۔ خیر معلوم ہوگیا کہ بمبئی میں اچھی کٹیگی۔

دوسرے دن صبح ساڑھے چھ بجے بمبئی پہونچ گئے۔ یہ تو اسباب سمٹوانے میں رہے اور میں کرایہ کی موٹر لے بمبئی ہوٹل پہنچا۔ بیسیوں دفعہ وہاں ٹھہرا ہوں۔ سب سے ملاقات ہے۔ منیجر صاحب سے ملاقات کیا دوستی ہے۔ پہلے انہی سے ملا اور کہا " ایک صاحب آرہے ہیں۔ میرے کمرے کے برابر ہی ان کو کمرہ دینا۔ اور ذرا ادھر ادھر جائیں تو مجھکو اطلاع کردیا کرنا۔ اسوقت تو بس اتنا ہی سن لو۔ باقی پھر کہوں گا۔ خیر میں تو ان سے یہ کہہ تیسری منزل کے کمرہ نمبر (۳۶) میں

جا لگا۔ اوپر سے دیکھا تو صاحب بہادر کی لدی پھندی دو موٹریں نیچے دروازہ کے سامنے آکر ٹھہریں۔ اسباب چلنا شروع ہوا۔ تھوڑی دیر میں آگے آگے منیجر صاحب اور پیچھے پیچھے ہمارے دوست آئے۔ کمرہ نمبر ۳۵ کھولا گیا۔ اور اُس میں انھوں نے قیام فرمایا۔ منیجر صاحب ان سے فارغ ہو۔ میرے پاس ائے اور کہنے لگے "یہ کیا بات ہے جو آپ نے کہا تھا بجنسہ وہی انھوں نے کہا۔ آتے ہی پوچھا کہ "ابھی جو صاحب آئے ہیں وہ کون سے کمرہ میں ٹھہرے ہیں؟" میں نے کہا "نمبر ۳۶ میں" انھوں نے فرمایا "ہمیں اُن کے برابر والا کمرہ دو۔ اور جب وہ میز پر آئیں تو ہم کو اطلاع دیا کرو" میں نے منیجر صاحب سے کہا "ذرا تم نیچے جاؤ۔ میں ابھی آکر سارا قصہ بیان کرتا ہوں۔ اور ہاں میرے کمرہ کے سامنے جو ہندوستانی پیخانہ ہے اُس کا لوٹا اٹھوا دو۔ صاحب کو لوٹوں سے بڑی نفرت ہے۔ اسٹیشن پر قلیوں سے لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی" بچارے منیجر پریشان تھے کہ یہ خاصہ بھلا چنگا آدمی دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ کچھ بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں میں نے جاکر اُن کو سب کچھ سمجھا دیا۔ کہنے لگے "بھئی ذرا دیکھنا ایسی کوئی بات نہ ہو کہ ہوٹل بدنام ہو جائے۔ لطف تو ضرور آئیگا۔ مگر یہ بیوپار کا معاملہ ہے" میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھیئے۔ بٹلروں سے کہہ دیجئے کہ میں جو مانگوں وہ مجھکو بلا عذر لا دیا کریں۔ اسمیں آپ کا کیا نقصان ہے؟ اور آپ کے ہوٹل کی کیا بدنامی ہے؟ میں شکر کے بجائے اگر کافی میں کالی مرچیں ڈالکر پیتا ہوں تو آپکو واسطہ؟ آپ کو اپنی رقم سے کام" معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے اتنا کہنے پر کچھ سمجھ گئے۔ اور خود بھی صاحب بہادر کے آداب مجلس کی عملی تعلیم کا لطف اُٹھانے پر تیار ہو گئے۔

ہاتھ منھ دھو۔ کپڑے بدل۔ میں نیچے اُترا۔ اور دوسری منزل میں جو کھانے کا کمرہ ہے اُس میں داخل ہوا۔ جتنے بٹلر تھے وہ مجھے پہچانتے تھے۔ دیکھکر ذرا مسکرائے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ منیجر صاحب نے ضروری ہدایتیں دیدی ہیں۔ سڑک کے رُخ پر جو میز بچھی ہوئی تھی اُسپر میں جا بیٹھا۔ میرے سامنے بڑا آئینہ تھا۔ پیچھے دو میزیں اور تھیں۔ سیدھے ہاتھ پر سڑک تھی۔ اور بائیں طرف اور بہت سی میزیں کرسیاں اور سامان کا کمرہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صاحب بہادر کو بھی میری میز پر پہنچ جانیکی اطلاع ہوئی۔ وہ نیا سوٹ پہنے۔ ٹوپی اُتارے۔ سگار پیتے۔ بڑے ٹھاٹھ سے کمرہ میں داخل ہوئے۔ ادہر اُدہر دیکھا۔ اور کچھ دل میں سوچ کر میری پُشت کی جانب جو میزیں

بچھی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اسطرح بیٹھنا چاہتے ہیں کہ یہ مجھکو دیکھ سکیں کہ میں کسطرح کھانا کھاتا ہوں۔ اور میں ان کو نہ دیکھ سکوں۔ لیکن شاید ان کو اس کا خیال نہ رہا کہ میرے سامنے یہ بڑا آئینہ لگا ہوا ہے۔ اور ان کے سب حرکات مجھکو اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزرے تو مجھے یہ دیکھکر بڑا تعجب ہوا کہ ان کے کوٹ کے کالر میں پیچھے کی طرف ایک پرچہ پن سے لگا ہوا ہے۔ بہت غور کیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ کیا معمہ ہے۔ استنے میں ٹیلر نے پورج[1] کی رکابی۔ شکر اور دودھ سامنے لا رکھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ "منیجر صاحب کو بلاؤ"۔ وہ دروازہ ہی تک گیا ہوگا کہ منیجر صاحب خود مسکراتے ہوئے آئے۔ اور میرے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے آہستہ سے اُن سے کہا "مسٹر ذرا چپکے سے یہ تو دیکھ آؤ کہ ہمارے صاحب کے کالر پر یہ کاغذ کیا لگا ہوا ہے"۔ وہ میرے پاس سے اُٹھ۔ صاحب کے پاس پہنچے۔ اور پہلو میں کھڑے ہوکر پوچھا "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ اگر کسی انتظام کی ضرورت ہو تو کردیا جائے"۔ صاحب نے فرمایا "نہیں۔ سب ٹھیک ہے"۔ یہ باتیں کرتے کرتے منیجر صاحب نے اُس کاغذ پر بھی نظر ڈال لی۔ مگر کچھ جو می کنم میں ہو گئے۔ وہاں سے ٹہلتے ٹہلتے میرے پاس آئے۔ اور وہی سوال مجھ سے کیا۔ میں نے بھی جواب دیا۔ اور آہستہ سے پوچھا "آپ نے کاغذ دیکھا؟" کہا کہ "ہاں دیکھا۔ اُس میں لکھا ہے "ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کیا معنی ہیں"۔ میں نے کہا "آپ نہ سمجھے ہوں۔ میں سمجھ گیا۔ صاحب نے نئے سوٹ بنوائے ہیں۔ اور اپنی کتاب دیکھکر ہر سوٹ پر اُسکے پہننے کا وقت لکھدیا ہے۔ یہ ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک پہننے کا سوٹ ہے۔ گھبراہٹ میں کاغذ لگا لے بغیر کوٹ پہن آئے۔ چلو ان کی صاحبیت کا کچھ تو رنگ معلوم ہوگیا۔ اب دیکھو دوسرا تماشہ دکھاتا ہوں"۔ صاحب بہادر اسوقت اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ میں نے اپنی رکابی اسطرح رکھی کہ وہ دیکھ سکیں کہ میں پورج کسطرح کھاتا ہوں۔ میں نے نمک کا چمچہ بھرا۔ رکابی تک لایا۔ اور اسطرح اُلٹا کہ نمک بجائے رکابی کے

---

[1] ۔ پورج کو بس دلیہ سمجھیے۔ فرق یہ ہے کہ دلیہ میں دودھ۔ شکر اور چاول ملا کر پکاتے ہیں۔ پورج میں دلیہ الگ پکایا جاتا ہے۔ شکر اور دودھ کھانیوالا اپنے حسب خواہش ملا لیتا ہے۔

میرے نیپکن[1] میں گرا۔ اسطرح دو تین چمچے بھر بھر کر ڈالے۔ بعد میں سرکہ کی بوتل لی۔ اُس کے مُنھ پر اُنگلی رکھکر رکابی میں اسطرح اُلٹی گویا سرکہ ملا لیا۔ صاحب اخبار کی آڑ سے میرے ان حرکات کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد رکابی میں نے ذرا سرکا کر اپنے سامنے کر لی۔ اور جلدی جلدی شکر کے دو تین چمچے ڈال۔ دودھ اُنڈیل۔ چمچے سے ملا۔ پھر رکابی ذرا اُنکی طرف کر کے کھانا شروع کیا۔ وہ پورج کھانے کی ترکیب سمجھ گئے۔ نہایت اطمینان سے دل کھول کر نمک اور سرکہ ملایا اور چمچہ سے کھانا شروع کیا۔ منیجر صاحب اور بٹلروں کو ھنسی آئی۔ بچاروں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور ایک ایک کر کے سب سرک گئے۔ اس کے بعد میں نے جو چیز کھائی۔ ذرا سلیقہ سے کھائی۔ اور صاحب نے بھی ہو بہو نقل اُتاری۔ یہ میں نے اسلئے کیا کہ کھیں کھٹک نہ جائیں اور مزا کرکرا ہو جائے۔

اس کے بعد میں جے۔ جے اسپتال میں ڈاکٹر ڈگن سے ملنے کا وقت دریافت کرنے چلا گیا پھر پھرا کر کوئی ایک بجے واپس آیا۔ دیکھا کہ صاحب بہادر اپنے کمرہ میں براج رہے ہیں۔ شاید ان کو میرے آنے ہی کا انتظار تھا۔ کیونکہ ادھر میں کھانے کے کمرہ میں آیا اور اُدھر وہ بھی آ پہنچے۔ لنچ شروع ہوا۔ پہلے تو صحیح صحیح کارروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں نے توس اٹھایا۔ چھری سے اُسپر مکھن ملا۔ رائی کی بوتل میں چھری ڈال۔ تھوڑی سی رائی نکالی اور ذرا پہلو بدل۔ اسطرح ہاتھ چلایا۔ گویا توس پر رائی مل رہا ہوں۔ بھلا نقل را چہ عقل۔ انھوں نے بھی کچھ انتظار کر کے پوری نقل اُتاری۔ ادھر میں نے توس مُنھ میں رکھا اور اُدھر اُنھوں نے اپنے توس پر مُنھ مارا۔ خبر نہیں بچارے کے حلق پر کیا گذری۔ ہاں آئینہ میں یہ ضرور دیکھا کہ ایک دفعہ ہی اُن کے چہرے کی حالت کچھ بدل سی گئی۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ مُنھ سے نوالہ نکال کر پھینک دیں۔ مگر میں ایک دفعہ ہی اُن کی طرف مُڑ گیا۔ اب بچارے کو نہ نوالہ اُگلتے بنتی ہے نہ نگلتے۔ آخر کسی نہ کسی طرح حلق سے اُتار ہی لیا۔ اس کے بعد میں نے اُن سے باتیں شروع کیں۔ باتیں کرتا جاتا۔ اور توس کھاتا جاتا۔ اُنھوں نے بھی ڈرتے ڈرتے توس کا دوسرا ٹکڑا مُنھ میں رکھا اور چاء کے سہارے نیچے اُتارا۔ خدا خدا کر کے توس ختم ہوا۔ میں نے بھی اس سے زیادہ کارروائی کرنی مناسب نہ سمجھی۔ نیپکن لپیٹ میز پر ڈالا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

---

[1] نیپکن رومال جیسا چوکور کپڑا ہوتا ہے جو کھاتے وقت گود میں پھیلا لیتے ہیں تاکہ کھانا گرنے سے کپڑے محفوظ رہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اپنے کمرہ میں آ گئے۔ اور حمام میں جا کلّیاں کرنی شروع کیں۔ خدا جھوٹ
نہ بلوائے۔ ہزاروں ہی کلّیاں کر ڈالیں جب کہیں جا کر کچھ ٹھنڈک پڑی۔ مجھے افسوس بھی ہوا۔ اور
ہنسی بھی آئی۔ افسوس تو اس لیئے ہوا کہ بیٹھے بٹھائے ایک غریب کا منھ چھلنی کر دیا۔ اور ہنسی اس
بات پر آئی کہ اس بیوقوف کو صاحب بننے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر لنچ بھی خاصہ مزے سے گزر گیا۔
سہ پہر کو میں ڈاکٹر ڈگن سے ملا۔ تمام کیفیت بیان کی۔ اپنے مدراس جانے کا ذکر کیا۔ وہاں
والوں کی رائے ظاہر کی کہ کسطرح کئی گھنٹے آنکھوں کا امتحان کرنے کے بعد مجھے صاف جواب دیا گیا۔
ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں ایسی کہیں کہ میرے دل کو لگ گئیں۔ کہنے لگے "میں کسی کی برائی نہیں کرتا۔
ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ آنکھوں کا زیادہ دیر تک امتحان کرنا کچھ مفید نہیں ہوتا۔ مریض کی آنکھیں گھورتے
گھورتے پتھرا جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد صحیح نتیجہ نکالنا دشوار ہوتا ہے۔ اب رہی تمہاری حالت تو
اس کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ آنکھوں کا تم کو کوئی مرض نہیں ہے۔ صرف صحیح نمبر کی عینک کی
ضرورت ہے۔ ولایت جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ مگر یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں کر سکتا ہوں۔ اس سے
زیادہ کی وہاں بھی تم کو توقع نہ کرنی چاہیئے۔ یورپ والوں کی یہ کیفیت ہے کہ بچپن ہی سے
آنکھوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ذرا کچھ فرق آیا اور آنکھ کے ماہر فن کے پاس پہنچے۔ علاج کیا۔
عینک لی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ ہمارے ہاں لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب آنکھیں بالکل تباہ ہو جاتی ہیں
اُسوقت علاج کا خیال آتا ہے۔ خیال آنے اور اُس پر عمل کرنے میں بھی برسوں گزر جاتے ہیں آخر
خدا خدا کر کے ڈاکٹر کے پاس آتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ آج ہی اچھے ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے
کہ روزانہ جس رنگ برنگ کے مریض ہمارے دیکھنے میں آتے ہیں ویسے ولایت کے ڈاکٹروں کو
برسوں میں بھی نہیں ملتے۔ اور جتنے آپریشن ہم ایک ہفتہ میں کر لیتے ہیں۔ وہاں کے ماہرین فن کو
سال بھر میں بھی نہیں کرنے پڑتے۔ اس لیئے یہ خیال تو بیکار ہے کہ ولایت جا کر تم یہاں سے کچھ
زیادہ فائدہ حاصل کر سکو گے۔ ہاں اپنے اطمینان کے لیئے جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔" میں نے
کہا "ڈاکٹر صاحب! اندھا کیا چاہے۔ دو آنکھیں۔ جب یہیں مجھکو آرام ہو جانا ہے تو پھر میں کوئی
دیوانہ ہوا ہوں کہ خواہ مخواہ روپیہ خرچ کر کے جرمنی یا فرانس جاؤں۔ اچھا اب آپ عینک کے
نمبر نکالیئے۔" اُس ہیرے شیر نے دس منٹ میں نمبر نکال۔ میرے حوالہ کیئے۔ اس کے بعد کچھ

سوچ کر کہا "خیر ٹھیرو۔ میں دوا ڈال کر بھی نمبر دیکھ لیتا ہوں۔ اگر تھوڑی بہت کچھ غلطی ہوئی ہے تو وہ بھی نکل جائیگی" یہ کہہ اُنھوں نے میری آنکھوں میں دوا ڈالی اور دوسرے روز سہ پہر کو پھر آنیکی ہدایت کی۔ یہاں سے نکل میں پھرتا پھراتا شام کو ہوٹل پہنچا۔ دوا پڑنے سے ذرا آنکھ میں پردہ سا آگیا تھا۔ اسلیئے رات کا کھانا میں نے اپنے کمرہ ہی میں کھایا۔ صاحب بہادر نے بھی میری تقلید کی۔ دوسرے دن بھی میں کھانے کمرہ میں نہیں گیا۔ مگر چونکہ ہمارے صاحب ان دو وقت کے کھانوں سے واقف ہو چکے تھے اسلیئے اُنھوں نے ناشتہ اور لنچ کھانے کے کمرہ ہی میں جاکر کھایا۔ منیجر صاحب میری خیریت پوچھنے آئے۔ اُن سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ صاحب نے کل کا سبق پوری طرح دُھرایا۔ ہاں اُس روز توس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سہ پہر تک میری آنکھیں صاف ہو گئیں۔ میں نے جاکر ڈاکٹر ڈگن کو دکھائیں۔ معائنہ کے بعد اُنھوں نے کہا کہ "میں پہلے اور اب کے نمبروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ شوق سے انہی نمبروں کی عینک خریدیئے۔ بہت دنوں کام دیگی۔ مگر جب اُتر جائے تو مجھ سے آکر ضرور ملیئے۔ کہیں اُترے ہوئے نمبروں کی عینک نہ لگائے پھریئے۔ آنکھیں ستیاناس ہو جائینگی" وہاں سے نمبر لے۔ میں ونستا ایم۔ وستور کی دوکان پر پہنچا۔ نمبر دیئے۔ اُنھوں نے دوسرے روز عینک دینے کا وعدہ کیا۔ اور میں چوپاٹی اپالو بندر اور ہارنبی روڈ کی سیر کرتا ہوا رات کو کوئی ساڑھے سات بجے ہوٹل پہنچ گیا۔ چونکہ میرے قیام کا یہ آخری دن تھا۔ اسلیئے مجھے شرارت سوجھی۔ کھانے کے کمرہ میں جو سامنے الماری تھی اُس میں سلفر بٹرز[1] کی ایک بوتل خبر نہیں کیوں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ صاحب کو آج یہ پلادو۔

رات کو کھانے کیلیئے کمروں میں سے ہم دونوں ساتھ نکلے میں نے صاحب سے پوچھا "فرمائیے کچھ پینے کا بھی شوق ہے؟" کہنے لگے "ہاں پیتا ہوں۔ مگر کم۔ زیادہ پینا صحت کو مُضر ہے" میں سمجھ گیا کہ یہ پیتے پلاتے نہیں۔ صرف انگریزی کپڑوں کی لاج رکھنے کیلیئے پینے کے دعویدار ہو گئے ہیں۔

---

[1] سلفر بٹرز آتشک کی دوا ہے۔ شاہترہ۔ چرائتہ اور چند تلخ ادویات کے عرق میں گندھک کو حل کرکے بنائی گئی ہے۔ ایسی تلخ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔

خیر۔ نیچے آکر وہیں اپنی اپنی نشستوں پر دونوں بیٹھ گئے۔ کھانا شروع ہوا۔ میں نے بٹلر کو آواز دی کہ سلفر بٹرز کا ایک پگ لاؤ۔ وہ بیچارا گھبرا گیا کہ ہیں! کہیں اس بھلے آدمی کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ سیدھا نیچر صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ سمجھ گئے کہ کچھ تماشہ ہونے والا ہے۔ آگے آگے وہ۔ اور پیچھے پیچھے بٹلر دونوں کمرہ میں آئے۔ بٹلر نے الماری کھول کر سلفر بٹرز کی بوتل سے ایک پگ نکال میرے گلاس میں ڈالا۔ میں نے سوڈا منگا کر گلاس بھر لیا۔ اور کھانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد گلاس اٹھاتا۔ منہ تک لیجاتا۔ اور پھر گلدان کی آڑ میں رکھ دیتا کہ کہیں صاحب یہ نہ دیکھ لیں کہ بھرے کا بھرا گلاس ہے۔ میری دیکھا دیکھی انھوں نے بھی سلفر بٹرز کا ایک پگ لیکر اسمیں سوڈا ملوایا۔ اس کے بعد جو ایک گھونٹ لیا تو قیامت آگئی۔ میرے ہاں تو برابر گھونٹ پر گھونٹ چل رہا تھا۔ وہ بھلا اپنا ہاتھ روک کر کیوں اپنی عنک کراتے۔ کسی نہ کسی طرح پیئے ہی گئے۔ بٹرز ایک قسم کی شراب بھی ہوتی ہے۔ سمجھے ہونگے کہ جب بٹرز کا ذکر انکی کتاب آداب مجلس میں ہے شاید وہ یہی ہوگی۔ غرض گلاس ختم کرنا مشکل ہو گیا۔ بڑا گھونٹ لیں تو حلق سے اترنا مشکل چھوٹے گھونٹ لیں تو گلاس کا ختم ہونا دشوار۔ آخر بصد خرابی بصرہ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد گلاس ختم ہوا۔ مگر صاحب بہادر کی طبیعت کچھ ایسی بگڑ گئی کہ میٹھا کھائے بغیر میز پر سے اٹھ گئے۔ کمرہ میں جا کر انپر کیا گذری۔ یہ تو خدا کو معلوم ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ دوسرے دن بیچارے نے دو وقت کا فاقہ کیا۔ میں دوسرے دن سہ پہر کو ونشا کی دوکان پر گیا اور عینک لے آیا۔ ایسی ٹھیک بیٹھی کہ دل خوش ہو گیا۔ اب گھر جانے کی سوجھی۔ اور شام ہی کو روانہ ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔

جب دوسروں کی ہنسی اڑائی تو اپنی بیوقوفی کو کیوں چھپاؤں۔ ایک مسلمان بھائی نے مجھے بھی بیوقوف بنایا۔ اور خوب بنایا۔ ونشا کی دوکان سے ہی ٹریم میں سوار ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ ایک بھلے آدمی ٹریم میں داخل ہوئے۔ انکی شکل ابتک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ چھریرا بدن۔ سفید رنگ۔ میانہ قد۔ بھورے بال۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ جسم پر خاکی کوٹ پتلون۔ کوٹ کے اوپر بغیر ہاتھوں کے کیپ دار برساتی۔ جب ٹریم میں وہ میرے پاس سے گذرنے لگے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری شیروانی کی جیب میں سے روپیوں کا بٹوہ کچھ خود بخود اوپر کو اٹھا چلا آرہا ہے

میں نے ایک دفعہ ہی جیب پر ہاتھ ڈالا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بٹوہ جیب سے آدھا باہر آگیا۔ خیر بٹوہ کو اندر کیا۔ اور اُن صاحب کیطرف دیکھکر مسکرایا کہ آپ تیز ضرور ہیں۔ مگر میں آپ سے بھی کچھ زیادہ تیز ہوں۔ اُنھوں نے شرماکر گردن نیچے کرلی۔ تھوڑی دیر میں ٹریم ٹھیری۔ دو آدمی اندر آگئے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن صاحب سے کچھ باتیں ہوگئیں۔ اُس وقت میں نہیں سمجھا تھا۔ مگر بات بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہ دونوں اُن حضرت کے ساتھی تھے۔ خیر۔ یہاں سے چلکر ٹریم کرافورڈ مارکٹ پر رکی۔ ترکی ٹوپی والے صاحب پہلے اُتر گئے۔ اور ان کے دونوں یار بھی نیچے اُترنے کو ایک ساتھ بڑھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں دروازہ میں پھنس گئے۔ مجھے اُترنے کی جلدی تھی۔ میں ان دونوں کو چیر کر نیچے اُتر گیا۔ جو صاحب پہلے نیچے اُترے تھے اُن کو دیکھکر میں مسکرایا کہ جناب ہر شخص کی جیب سے بٹوہ نکالنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر بجائے شرمندہ ہونے کے وہ بھی مسکرائے اور ایک طرف چلدیئے۔ اب جو جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو بٹوہ غائب۔ اُسوقت ان لوگوں کی ترکیب سمجھ میں آئی کہ ایک صاحب نے نیچے اُتر کر مجھے مطمئن کردیا۔ دو نے اسطرح راستہ روکا کہ مجھے دونوں ہاتھوں سے اُن کو ہٹانا پڑے۔ اُن میں سے ایک نے اس کشمکش میں بٹوہ غائب کردیا۔ غنیمت یہ ہوا کہ جتنے روپیے میں لیکر گیا تھا وہ عینک والے کو دے آیا تھا۔ شاید پانچ روپیے کا ایک نوٹ اور کچھ آنے رہگئے تھے۔ ہاں ڈاکٹر ڈگن نے عینک کے جو نمبر دیئے تھے وہ بٹوے کے ساتھ گئے۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے من ضحک ضُحِکَ (جو دوسروں پر ہنستا ہے اُسپر دوسرے ہنستے ہیں) بہرحال میں ہوٹل میں سے جاکر اور روپئے لایا۔ دوسرا بٹوہ خریدا۔ دنشا کے ہاں جاکر نمبروں کی نقل لی۔ لیکن اس کارروائی نے کچھ ایسا کھسیانا کردیا کہ پھر اپنے صاحب بہادر کو بھی بھول گیا۔ سات بجے کمرہ ہی میں کھانا منگا کر کھالیا۔ اور ساڑھے آٹھ بجے کے میل سے روانہ ہوگیا۔ بلا سے روپئے گئے تو گئے۔ ایک مزے دار مضمون تو مل گیا۔ ہاں یہ کہے دیتا ہوں کہ پڑھنے والے حضرات براہ کرم حتی المقدور اسکو فرضی قصہ سمجھنے کی کوشش کریں تو زیادہ مناسب ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب تسلیم ـ مضمون بھیجتا ہوں ـ مگر آپ دیکھتے ہی کہینگے کہ ہیں ـ یہ تو متانت سے گرا ہوا ہے ـ اجی ہاں ـ گرا ہوا ہے ـ اور ضرور گرا ہوا ہے ـ اور کیوں نہ گرتا ـ میں نے خود گرایا ہے "نستعلیق اصحاب" کا کلام تو بہت کچھ چھپ چکا ہے ـ اور چھپیگا ـ کچھ دلّی کے "یار لوگوں" کی غپیں بھی ہو جائیں ـ متانت کی گفتگو نہیں ہے تو نہ سہی ـ پرانے زمانہ کی سوسائٹی کے ایک پہلو پر تو روشنی پڑتی ہے ـ خیاب والا! یہ "یار لوگ" نہ ہوتے تو دلّی کا ہیکو لٹتی ـ امیر تیمور اور نادر شاہ جیسوں نے دلّی کی تاریخ بنائی ہے ـ اور ان حضرات نے یہ تاریخ بنوائی ہے ـ محمد حسین آزاد تو ہائے دلّی ہائے دلّی کی راگنی سُناتے سُناتے اُٹھ گئے ـ اب میری باری ہے ـ میں بھی وہی دُھن الاپتا ہوں کہ ہائے دلّی ـ

ہائے کیا کہوں جب پہلی باتیں یاد آتی ہیں ـ دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے ـ نہ وہ اب صحبتیں رہیں نہ وہ محبت ـ نہ وہ دلی والے رہے نہ وہ زندہ دلی ـ نہ وہ بیفکری رہی نہ وہ وضعداری ـ کوئی گھر نہ تھا جہاں روزانہ کم سے کم دو چار دوست جمع نہ ہو جاتے ہوں ـ گھر میں جگہ نہ ہوئی تو کیا پروا ہے دل میں تو جگہ تھی سڑک ہی پر مونڈھے بچھ جاتے ـ جب منگو کے چھتہ سے گذرتا ہوں تو پرانی صحبتیں یاد کر کے دل بیٹھ جاتا ہے ـ چھتہ سے ملا ہوا ہی میر صاحب کا مکان تھا ـ مردانہ کا کوئی حصہ نہ تھا ـ پھر بھی ڈیوڑھی ہی سے کام نکال لیا جاتا تھا ـ ڈیوڑھی میں دس بارہ مونڈھے ہیں ـ کچھ پرانے ـ کچھ نئے کچھ ٹوٹے ہوئے ـ کچھ ثابت ـ بعض بان سے بنے ہوئے ـ بعض پر ہرن کی کھال منڈھی ہوئی ـ بازو میں لے آؤ ان کا ایک جھلنگا پڑا ہوا ہے ـ اور میر صاحب اسپر براجے رہتے ہیں ـ یار دوست آتے ـ حقہ پان سے تواضع کیجاتی ـ اور یکجہتی اور اتحاد کے دم لگائے جاتے ـ اب نہ وہ دلّی ہے اور نہ وہ جلسے ـ جدھر جاؤ ـ یہ لے وہ دے کی صدا ہے ـ جس طرف نکل جاؤ ٹکوں کا ذکر اور نفع نقصان کا فکر ہے ـ بچے کھچے گنتی کے چند پرانے گھرانے رہگئے ہیں ـ ان کی حالت بھی "تو چل میں آیا" پر پہنچ گئی ہے ـ

اس کے بعد پھر اللہ ہی اللہ ہے۔

میر صاحب کا مکان دیکھتا ہوں تو پچھلے نقشے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ یہ کون ہیں کہ مرزا صاحب! آئیے آئیے مرزا صاحب۔ آپکی تو شکل ہی نظر نہیں آتی۔ کئی روز سے انتظار تھا آخر کہاں غائب ہو گئے تھے۔ آئیے۔ بیٹھئے۔ میاں صاحبزادے۔ ہمارے مرزا صاحب کیلئے حقہ تو لاؤ۔ مگر دیکھنا ذرا تو اٹھنڈا کر لینا۔ کہیں بھڑک نہ جائے۔ سامنے کے ٹین میں اُپلا دبا ہے۔ اور دیکھنا اُس طاق میں تمبا کو رکھا ہے۔"

مرزا صاحب کی شکل ملاحظہ فرمائیے۔ سات فٹ کا قد۔ سفید رنگ۔ کتابی چہرہ ستواں ناک۔ غلافی آنکھیں۔ اُن میں قدرتی لال ڈورے۔ چڑھی ہوئی داڑھی۔ جسکا ایک ایک بال سرکار انگریزی کی فوج کی طرح اپنی اپنی جگہ ٹینشن (استادہ) سر پر چوگوشیہ ٹوپی۔ نیچی چولی کا انگرکھا۔ اسپر نیم آستین۔ جسکا سینہ کھلا ہوا۔ ایک بر کا پاجامہ۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔ ہاتھ میں رام پوری بانس کی چھڑی۔ اوپر چاندی کی موٹھ۔ نیچے لوہے کی شام۔ ہنستے ہوئے آئے اور نہایت متانت کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے" میاں صاحبزادے کہو۔ میر صاحب کچھ پڑھاتے بھی ہیں یا صرف چلمیں ہی بھرواتے ہیں" میں آداب کر کے خاموش ہو گیا۔

مرزا صاحب"ارے میاں میر صاحب! کیا کروں مرزا نوشہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اُدھر گیا اور پھنسا۔ کئی روز سے آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ لیکن وہاں سے نکلتے نکلتے وقت ایسا تنگ ہو جاتا تھا کہ ادھر آنیکی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بارے خدا خدا کر کے اُن سے آج ذرا سویرے پنڈ چھڑایا تو تم سے ملنا نصیب ہوا۔ ارے بھئی ہمارا کیا ہے۔ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ اور ہاں میر صاحب! وہ ہمارے یار شیخ جی کہاں ہیں۔ اُنکو بہت دن سے نہیں دیکھا"

میر صاحب"اب آتے ہی ہونگے۔ ایلو۔ وہ آئے۔ یار بڑی عمر ہے۔ ابھی مرزا صاحب تم کو یاد کر رہے تھے"

شیخ جی بڑے سُوکھے سہمے آدمی تھے۔ داڑھی بھی کچھ واجبی ہی سی تھی۔ رنگت تو اتنی کالی نہ تھی۔ لیکن چیچک کی وجہ سے منھ پر کچھ پھٹ سی سی اُڑنے لگی تھی۔ مگر تھے بڑے وضعدار عمر گو پچاس سے بہت اوپر تھی۔ پھر بھی گوشہ کی ٹوپی اور مشروع کا پائجامہ نہ چھوٹتا تھا۔

شیخ جی: "اوہو۔ مرزا صاحب اور یہاں! ہم تو سمجھتے تھے کہ تم مرزا نوشہ کے ہو رہے۔ میاں ہم بھی شاعر ہیں۔ ہمارے بھی اُستاد ہیں۔ لیکن یار اسطرح اُستاد کا دُم چھلّا کوئی نہیں ہوتا۔ شاعری کیا ہوئی بلائے جان ہوئی۔ اور اُستاد کیا ہوئے کہ ناسہ ہو گئے۔ بندۂ خدا۔ جاؤ۔ ملو۔ اصلاح لو۔ لیکن یہ تو نہیں کہ یاروں کو بھی چھوڑ بیٹھو۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو۔ تیرھویں صدی ہے"

باہر سے آواز آئی۔ "کیوں بھئی ہم آئیں"؟

شیخ جی: "آیئے۔ آیئے۔ واہ بھئی واہ۔ میں سمجھا تھا کوئی بھلا آدمی ہوگا۔ کیا خبر تھی کہ الغرض یہ خواہ مخواہ مرد آدمی آئے ہیں۔ کیوں میاں نواب! یہ تم کو آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا پرایا گھر سمجھے تھے؟ دیکھو حضنت (حضرت) دوستوں میں یہ تکلفات ہوئے تو پھر دوستی کا خدا حافظ"

نواب بالکل شیخ جی کی ضد تھے۔ جتنے وہ دُبلے تھے۔ اتنے یہ موٹے۔ جتنے وہ ٹھنگنے تھے اتنے یہ اونچے۔ لمبان چوڑان میں اُنیس بیس کا فرق بھی باقی نہیں رہا تھا۔ مربع کی مثال میں آسانی پیش کیئے جا سکتے تھے۔ آگے پیچھے کی گولائی کے چکروں نے ثابت کر دیا تھا کہ حرف (S) کی ابتدا کیونکر ہوئی ہے۔ وزن کا اندازہ ترازوؤں کے ٹوٹنے سے کبھی نہ ہو سکا۔ روزی سے بیفکر تھے اسلیئے پیتے بھی تھے۔ اسوقت بھی بھنگیائے ہوئے تھے۔ لیکن نہ ایسے کہ بہک نکلیں۔ لباس تو وہی پرانی وضع کا تھا۔ مگر منڈا جوتہ زمانہ کے تغیرات کا اثر دکھا رہا تھا۔ اندر آتے ہی بڑے زور سے "سلام علیکم" کا نعرہ مارا۔ اور بیٹھنے کو ایک مونڈھے کیطرف بڑھے۔

میر صاحب: "بھئی نواب۔ ذرا سنبھل کے۔ واللہ میں نے آج ہی چھ آنے کو لیا ہے۔ تم بیٹھے اور یہ پچکا (پچکا) نا بھئی۔ خدا کے لئے تم اپنے اُسی مونڈھے پر جاؤ"

نواب: "یار موٹا ہونا بھی غضب ہو گیا۔ میر صاحب ایسا ہی مونڈھوں کا خیال ہے تو کبھی ہمارے لئے تخت بچھوا دو۔ اور اگر وزن ہی پر مونڈھوں کی تقسیم ہوتی ہے تو ہمارے شیخ جی کے لیئے ایک دُگڈُگی خرید لو"

شیخ جی: "دیکھو نواب۔ تم بہت چل نکلے ہو۔ جب دیکھو مجھپر حملہ کر بیٹھتے ہو۔ میرا دُبلا ہونا قیامت ہو گیا"

نواب: "تو شیخ جی۔ کیا موٹا ہونا کچھ گناہ ہے؟ جب دُبلے موٹوں کی ہنسی اُڑائیں۔ تو موٹے دبلوں کو کیوں چھوڑ دیں۔ آہا۔ مرزا صاحب بھی براج رہی ہیں۔ قسم خدا کی اندھیرے میں آپکی صورت

نظر نہیں آئی۔ اجی حضنت (حضرت) آج آپ کہاں آ نکلے"

مرزا صاحب "اندھیرے میں صورت نظر نہیں آئی۔ یا آنکھوں میں چربی چھا گئی ہے۔ شیخ جی جیسا ننھا منا آدمی تو نظر آ گیا۔ اور مجھ جیسا ھٹا کٹا آدمی نظر نہ آیا"

نواب "دیکھا شیخ جی۔ مرزا صاحب نے موٹے اور دُبلے دونوں پر ہاتھ صاف کیا۔ ارے میاں میر صاحب۔ یہاں حقہ تو نظر ہی نہیں آتا۔ آخر کنجوسی کی کوئی انتہا بھی ہے۔ دعوت وادت تو بخیر۔ یاروں پر حقہ پانی بھی بند کر دیا"

میر صاحب "خفا کیوں ہوتے ہو۔ ایلو حقہ بھی آ گیا۔ مگر بھئی تم بیٹھتے کیوں نہیں۔ کیا کھڑے پیر کا روزہ رکھکر آئے ہو"

نواب "بیٹھوں کہاں۔ دیکھ رہا ہوں کہ کون سا مونڈھا اس تن نازک کو سہار سکیگا۔ بھئی تم جانتے ہو مثل ہے مونڈھا بقدر ڈھونڈا"

مرزا صاحب "واہ بھئی واہ۔ خدا کی قسم کیا بُے تکی مثل کہی ہے۔ اور حضنت یہ ڈھونڈا کونسی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کے معنی کیا ہیں"؟

نواب "آ کا تم نے کبھی سنسکرت بھی پڑھی ہے؟"

مرزا صاحب "نہیں"

نواب "یہ خاص سنسکرت کا لفظ ہے! اور اس کے معنی ہیں جسم۔ اور جسم بھی کمترین کا سا جسم۔ سمجھے"

مرزا صاحب "اس کا ثبوت"

نواب "یار عزیز تم کو تو مرزا نوشہ کی صحبت نے دین دنیا سے کھو دیا۔ اب تو تم سے بات کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ مُنہ سے کوئی بات نکلی اور تم نے کہا "ثبوت" کوئی ہم شاعر ہیں جو ثبوت کا گٹھڑ اپنے ساتھ ساتھ لیئے پھریں۔ مانتے ہو مانو۔ نہیں مانتے نہیں مانو۔ چلو چھٹی ہوئی" یہ کہتے کہتے نواب صاحب ایک مونڈھے پر ٹک ہی گئے۔ گو ابتدا میں مونڈھے نے بہت آہ وزاری کی۔ مگر آخر کو ع "بر سر اولاد نر سل ہر چہ آید بگزرد" کہہ کے خاموش ہو گیا۔

نواب "یہ کہو بھئی مرزا! آجکل نوشہ کس رنگ میں ہیں۔؟ اُس میرے یار نے تو دُنیا سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ میرا شعر کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ اب خدا جانے یہ اُنکے شعر کی خوبی ہے یا سننے والوں کی سمجھ کا قصور"

مرزا صاحب "دیکھو بھئی نواب۔ اُستاد کے متعلق ذرا سنبھل کے بولا کرو۔ جس چیز سے تمہیں مس نہیں ہے اُس میں خواہ مخواہ ٹانگ چلانے سے کیا فائدہ۔ اب رہے ہم تو ہم کو تمہارا جو جی چاہے کہہ لو"
نواب "اجی واہ آغا۔ تم تو بگڑ ہی گئے۔ خدانخواستہ ہم نے میاں نوشہ کو بُرے دل سے تھوڑے ہی کچھ کہا ہے۔ بھلا اُنکی استادی میں شک کرکے کون کافر بنے۔ لو حقہ لو۔ ذرا طبیعت ٹھنڈی ہو گی"
میر صاحب "ہاں مرزا صاحب۔ یہ تو کہو آجکل استاد ہیں کس رنگ میں۔ اُنکی تو عجیب حالت ہے صوفیانہ رنگ کو لیا تو مہینوں اسی رنگ میں رنگے رہے۔ رندانہ مضامین پر اُتر آئے تو برسوں اسی میں گھلا دئیے"
مرزا صاحب "آجکل عالمِ بیکسی و بے بسی کو نئے نئے انداز سے باندھ رہے ہیں۔ ہائے فرماتے ہیں۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

نواب "لو بھئی اب میں کچھ کہوں تو مفت کی لڑائی مول لوں۔ اجی حضرت۔ جسکی نہ بھٹے کبھی لڑائی وہ کیا جانے بٹیر پرائی۔ ان پر کو نسا بے کسی کا عالم گذرا ہے جو ان کے الفاظ میں درد اور اُن کے مضمون میں اثر ہوگا۔ بھئی بے کسی کا عالم ہم سے پوچھو۔ ہم سے پوچھو۔ یاروں پر جو گذری ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ میاں ہم سمجھتے ہیں کہ بے کسی اور بے بسی کس کو کہتے ہیں"
شیخ جی "اللہ خیر کرے آپ بھی شاعر ہو گئے"
نواب "واہ شیخ جی واہ سمجھے اور خوب سمجھے۔ ارے بندۂ خدا۔ یہ کس نے کہا ہے کہ میں شاعر ہوں میں نے تو یہ کہا تھا۔ کہ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھنے سے بیکسی کے مضمون نہیں سوجھتے۔ پہلے اس مصیبت کو جھیلو جب معلوم ہوگا کہ بیکسی اور بے بسی کیا چیز ہے"
میر صاحب "تو نواب صاحب۔ ہم بھی تو سنیں کہ وہ آپ پر ایسی کونسی بپتا پڑی تھی۔ جو آپ سے بہتر اس مضمون کو کوئی ادا نہیں کر سکتا"
نواب "نظم میں سناؤں یا نثر میں"
مرزا صاحب "خدا کے لئے آپ نظم پر تو رحم کیجئے۔ نثر ہی میں ارشاد فرمائیے"
نواب صاحب "مگر بھئی تم لوگ ہنسو گے۔ اور مجھے غصہ آئیگا۔ تم جانتے ہو کہ ایک کی بیکسی دوسروں کی ہنسی کا باعث ہو جاتی ہے"

شیخ جی "نواب صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ یار تمہاری مصیبت اور ہم ہنسیں بھائی توبہ کرو توبہ۔"
نواب صاحب۔ "اچھا بھئی اچھا کہتا ہوں۔ مگر ذرا حقہ تو ادہر سرکا دو" نواب صاحب کے طرف حقہ کھسکا دیا گیا۔ انہوں نے دو چار دم لگائے۔ مُنہ اوپر کر کے آہستہ آہستہ دُہواں چھوڑا اور ایک دفعہ ہی زور سے قہقہہ مار کر کہنے لگے "بھئی۔ اب ان واقعات کا خیال آتا ہے تو میں خود ہنسنے لگتا ہوں۔ مگر اس وقت کی میری بے بسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی دس برس کا زمانہ ہوا کہ ایک کام سے مجھے غازی آباد جانا پڑا۔ کبھی گھر سے نکلا نہ تھا۔ غازی آباد کا سفر بھی میرے لئے ولایت کا سفر ہو گیا۔ اس زمانہ میں میرا جسم بھی ماشاء کسی قدر بھاری تھا۔"
شیخ جی "اوہو۔ تو اب خیر سے آپ دُبلے ہیں۔ واللہ اُس زمانہ میں تو دیکھنے کے قابل ہو گے۔"
نواب "ہوں شیخ جی۔ خدا کے لئے جب انسانوں کا ذکر ہو تو آپ تو نہ بولا کریں۔ آپ کی کھال کو تو ربھی لگ گئی ہے نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔ میاں ہماری کھال ربڑ ہے ربڑ۔ جتنا اللہ کے فضل سے جسم میں اضافہ ہوتا ہے اتنی پھیلتی جاتی ہے۔"
میر صاحب "اجی شیخ جی۔ تم ہمیشہ مزے میں کھنڈت ڈال دیتے ہو۔ کہاں کی بات کہاں ملا دی۔ ہاں بھئی نواب آگے کہو۔ یہ کہتے کہتے میر صاحب اپنے جھلنگے پر کسی قدر دراز ہو گئے۔"
نواب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ کہتے کہتے رُک گئے اور بڑے زور سے قہقہہ مارا۔
مرزا صاحب "کیوں نواب کچھ خیر تو ہے۔ کہیں دورہ تو نہیں اُٹھا۔"
نواب "نہیں آغا۔ اسوقت یاروں کی نشست پر مجھے ایک پھبتی سوجھی ہے۔ قورمہ کا ہاتھ تو لاما واللہ کیا تشبیہ ہے۔"
مرزا صاحب "بھئی میں یہ معمّہ کچھ نہیں سمجھا آخر یہ ہے کیا۔ تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو۔"
نواب "بھلا یہ تو بتاؤ ہم کس سلسلے سے بیٹھے ہیں۔"
مرزا صاحب "پہلے میں۔ پھر شیخ جی پھر تم۔ اس کے بعد میر صاحب۔ میر صاحب جھلنگے پر کچھ بیٹھے ہیں کچھ لیٹے ہیں۔"
نواب "مرزا صاحب۔ تمہیں خدا کی قسم داد دینا۔ لا۔ ی۔ ی۔ لے کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے یا نہیں۔"
میر صاحب "میاں نواب تم بھی عجیب آدمی ہو۔ کیا کہہ رہے تھے۔ اور کدہر سے کدہر نکل گئے۔ آخر اپنا قصہ ختم کرو۔"

نواب ”ہاں بھئی تو میں نے کہاں تک کہا تھا؟“

میر صاحب ”تم غازی آباد پہنچے“

نواب ”خیر غازی آباد گیا۔ راستہ میں بہار کس کی ہچکولوں نے ہر کس نکال دیا۔ خدا خدا کر کے چار گھنٹے میں ۱/۲ ۵ کوس زمین طے ہوئی۔ تھکا ہوا تو تھا ہی۔ سرائے میں جا کر ایسی لمبی تانی کہ صبح کے نو بجا دیئے اٹھا تو پخانے کی تلاش ہوئی۔ لوگوں سے پوچھا۔ انہوں نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ ادھر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کونے میں ایک الماری کھڑی ہے۔ لیکن نظر نہیں آتا کہ پخانہ کہاں ہے۔ لوگوں سے پھر جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ جسکو میں الماری سمجھتا تھا وہی اُن بھلے مانسوں کا بیت الخلاء ہے۔ اب میری جسامت کو دیکھو اور اس الماری کو دیکھو رات ہوتی تو اِدھر اُدھر بادشاہی پودی لگا دیتا۔ دن اور وہ بھی نو بجے دن۔ کروں تو کیا کروں۔ جب بیتابی حد کو پہنچ گئی۔ تو اس الماری کا پٹ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چھوٹے سے قدمچے کے گرد آڑ کیلئے چیڑ کے تختے جڑ دیئے ہیں۔ اب سوچا اگر سیدھا اندر چلا جاتا ہوں تو اندر جا کر مڑونگا کیوں کر۔ آخر یہ ترکیب سوجھی کہ اُلٹے پاؤں اندر دھنس جاؤ۔ زور کر کرا کے اندر پہنچ ہی گیا۔ لوٹا رکھنے کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے میری توند کا۔ اسکے سہارے نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اور خدا خدا کر کے بیتابی میں بھی افاقہ ہوا۔ اب ختم کارروائی کے دو چار ہاتھ رہ گئے۔ یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ جبتک کہنیاں اور گھٹنے نہ پھیلیں یہ کام کیونکر ہو۔ الماری میں تو پہلے ہی انگوٹھی کا نگینہ بنا بیٹھا تھا۔ اس پھیلاؤ کی جگہ لاؤں تو کہاں سے لاؤں۔ آخر زور کر کے کہنیاں گھٹنے کچھ نہ کچھ پھیلا ہی دیئے اس زور از زوری میں پہلے تو پہلو کے تختوں نے چرچر چرچر چر کی۔ پھر ایک دفعہ ہی میری کہنیاں اور گھٹنے تختے توڑ پار نکل گئے اب ہزار کوشش کرتا ہوں نہ کہنیاں نکلتی ہیں نہ گھٹنے نکلتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مربع کے چاروں کونوں کو کلو سے کس دیا ہے۔ ایک ہاتھ میں بھرا ہوا لوٹا۔ دوسرا ہاتھ ذرا نیچے کی طرف مائل۔ غرض عجیب ہیئت کذائی بنگئی تھوڑی دیر تک تو میں نے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن کہنیاں اور گھٹنے نہ چھوٹنا تھے نہ چھوٹے۔ اتنے میں دوسرے مسافروں نے نکلنے کا تقاضا شروع کیا۔ پہلے تو میں ہوں۔ ہوں کر کے ٹالتا رہا۔ مگر جب کاٹھ میں کسے ہوئے گھنٹہ بھر گذر گیا۔ تو لاچار ایک مولوی صاحب سے جنہوں نے پانچویں چھٹی مرتبہ کھنکار اور دروازہ کھٹکٹایا تھا۔ میں نے کہا ”حضرت نکلوں تو کیونکر نکلوں۔ مجھکو تو آپ کے صندوق نے پکڑ لیا مجھسے ہلا کب جاتا ہے۔ آپ ذرا دروازہ کھول لیئے تو میری حالت معلوم ہو“ وہ بیچارے سمجھے کہ مجھے کسی بیماری کا دورہ ہوا ہے۔ دوسرے مسافروں کو بھی بلا لیا اور سب نے ملکر دروازہ کا پٹ شرماتے شرماتے کھولا۔ اندر انہوں نے جو بے بسی کی تصویر دیکھی ہوگی وہ آپ کی کسی شاعر کی حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ بہر حال غل مچ گیا کہ ایک صاحب پخانہ میں پھنس گئے۔ تمام شہر ٹوٹ پڑا۔ بڑھیوں نے ہتھیوں

تختوں کی بجریں نکالنا شروع کیں۔ ادہر میں نے زور لگایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ ہی میرے چاروں ہاتھ پاؤں نکل آئے لیکن ساتھ ہی اس کشمکش میں ایسا جھٹکہ لگا کہ میں منہ کے بل دروازہ پر گرا۔ صندوق تھیر اچیر کا اور وہ بھی باوا آدم کے وقت کا۔ بوجھ پڑا اسپر دس من کا۔ قبضے اور چولیں سب اُکھڑ گئیں۔ اور دروازہ کا دروازہ سارا اسپر اسامنے جا پڑا۔ ادہر میں اپنے زور میں قلابازیاں کھاتا ہوا تماشائیوں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ غرض مجھ غریب کا یہ دوسرا نقشہ بے کسی کا تھا جو ان دیہاتیوں کی ضیافت طبع کا باعث ہوا۔

ان تابڑ توڑ مصیبتوں نے مجھے ایسا سٹپٹا دیا کہ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مجمع کو چیرتا پھاڑتا بھاگا اور سامان وان چھوڑ چھاڑ سید صا بہار کس میں گھس گیا۔ بیل لگاتے لگاتے لوگوں نے بہار کس کا تماشہ بنا لیا۔ مگر یار یہ ضرور کہو نگا کہ جس شان و شوکت سے میں غازی آباد سے چلا ہوں ایسی روانگی کسی لاٹ صاحب کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

میاں مرزا جن لوگوں پر ایسی گذرے وہ بیکسی کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ پانی کا نام سنا تو دم نکلنے لگا اور کہنے لگے

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

یہ کہکر نواب صاحب لڑکھڑاتے لڑھکاتے دروازہ کی طرف چلے۔ سب کہتے ہی رہے "ارے میاں ٹھیرو ٹھیرو" لیکن یہ کب کسی کی ماننے والے تھے۔ دروازہ سے نکل یہ جا وہ جا۔ ان کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک تو سناٹا رہا پھر شیخ جی بولے۔ "کہو بھئی مرزا۔ اس نواب نے یہ سچا قصہ کہا یا صرف غپ ہی غپ اڑا گیا"

مرزا صاحب "شیخ جی کیا کہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نواب کے تیور تو بتا رہے تھے کہ سچ کہہ رہا ہے۔ آگے وہ جانے اور اسکا دین ایمان جانے"

میر صاحب: "میاں مرزا یہ قصہ سچ ہو یا جھوٹ۔ مگر یار یہ صحبتیں بھی یاد رہینگی۔ اب یہ میاں صاحبزادہ بیٹھے ہیں بڈھے ہونگے تو کہا کرینگے۔ کہ پرانے لوگ ایسے تھے اور ایسے تھے۔ ان قصوں کا خیال کر کے ہنسینگے لیکن ان صحبتوں کو یاد کر کے خود روئینگے۔ اور دوسروں کو رلائینگے سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

کچھ تو ان بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل تھی اور کچھ دل کا درد تھا جو دل سے نکلکر لفظوں کی شکل میں نوک قلم پر آ گیا

ان نینن کا یہی بسیکھ (دہر کیلنا)
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

دامِ خیال

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

"عالم تمام حلقہ دام خیال ہے" خیالات کے ساتھ ساتھ دنیا کا رنگ بھی بدلتا رہتا ہے۔
یہ تبدیلی خیالات ہی کا نتیجہ ہے کہ پہلے جن چیزوں کو اچھا سمجھتے تھے۔ وہ اب بری ہو گئیں۔
اور جنکو برا جانتے تھے وہ اچھی۔ موجودہ زمانہ کو گھٹتی کا پہرا کھتے ہیں۔ ہاں۔ ہوگا۔ بظاہر
تو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ روحانیت کٹ چھنٹ کر اب مادیت رہ گئی ہے اور امراض دیوتاؤں
کے رتبہ سے گھٹ گھٹا کر کیڑے مکوڑے بن گئے ہیں۔ ہر مرض کا ایک الگ کیڑا ہے
اور ہر آزار کا ایک جدا جرثومہ۔ وہ دن دور نہیں کہ اخلاقی امراض کے کیڑے بھی دریافت
ہو جائیں۔ خوردبینوں سے دکھا دئیے جائیں اور پچکاریوں کے ذریعہ سے ان کو جسم
میں داخل کر کے انسانوں کو روحانیت کے تمام مدارج طے کرا کے عرش معلی پر پہنچا دیا جائے
یا مادیت کے سب مراتب سے گزار کر اسفل السافلین سے بھی کچھ نیچے گرا دیا جائے۔

زمانہ کے اس انقلاب اور تحقیقات کے اس سیلاب نے خیالات کو دماغ میں کچھ اس طرح
زیر و زبر کیا کہ راہ ترقی میں دنیا کی موجودہ حالت اور زمانہ کی آئندہ کیفیت کا اندازہ لگاتے لگاتے
چشم ظاہر بین بند اور چشم بصیرت وا ہو گئی۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میدان میں کھڑا ہوں۔ اسکی وسعت کے کنارے پستی
و بلندی خیالات کی حدود سے جا ملے ہیں۔ اس کا سبزہ اپنی تازگی و طراوت سے گلزار ارم پر
چشمک زن ہے۔ اور اس کے غنچہ و گل اپنی نزہت و خوشنمائی سے آسمان خیال کی تاروں
بھری رات کو شرماتے ہیں۔ میدان کے بیچوں بیچ شیشہ کا ایک نازک اور خوبصورت گنبد ہے
جو بلندی میں خیال انسانی کا ہمسایہ اور صفائی میں دل مومن کا ہمپایہ ہے۔ گنبد میں یہ عجیب
و غریب صنعت ہے کہ اسکی بلندی خیالات[1] کی بلندی اور پستی کے بموجب کسی کو زیادہ اور کسی کو

---

[1] کیا انسان اور کیا انسان کے خیالات۔ کسی کے نزدیک دنیا سب کچھ ہے اور کسی کے نزدیک کچھ نہیں۔

کم معلوم ہوتی ہے۔ گنبد کی چوٹی پر کلس کی جگہ اقبال کا ستارہ[۵۱] بڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھکر اور حیرت ہوئی کہ گنبد کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرے پہلو کو تراش کر کچھ اسطرح صاف کر دیا ہے کہ اس پر پاؤں ٹکنا دشوار تو کیا محال ہے۔ میں اس صنعت عجیب اور تعمیر غریب کے نظارہ میں محو تھا کہ کسی نے میرے بائیں طرف[۵۲] سے کہا "کیا دیکھ رہا ہے۔ کچھ سمجھا بھی کہ یہ کیا طلسمات ہے۔ اسکو تماشہ نہ سمجھ۔ یہ میدان عالم خیال ہے اور یہ گنبد ترقی دنیا کا نقشہ ہے" مڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ خضر صورت منہ پر نکونی نقاب ڈالے پہلو میں کھڑے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ "حضرت آپ کون ہیں۔ اور یہاں میرے ساتھ ساتھ کیسے آئے" فرمایا "تو کیا۔ میں ہر ایک کے ساتھ رہتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں سب کو پہچانتا ہوں۔ مگر بہت کم لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ سمجھنے والے مجھے رہبر صادق اور تجھ جیسے ناسمجھ مجھے دل کہتے ہیں" میں نے عرض کیا " تو ہاں۔ جناب۔ یہ دنیا کا نقشہ ہے مگر یہ تو فرمائیے کہ کیونکر۔ ہم تو سنتے آئے ہیں کہ دنیا گول ہے۔ یہاں تو اسکی کچھ صورت ہی نئی ہے۔ ایک طرف گول ہے تو دوسری طرف سپاٹ۔ اب میں سمجھا۔ پرانے[۵۳] اور نئے خیالات کو ملا کر یہ کرۂ زمین تیار کیا گیا ہے" میرے اس بے موقع مذاق پر انکو غصہ آگیا۔ جھڑک کر بولے۔ "سچ ہے جو دنیا میں اندھا رہا۔ وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہیگا۔ بیوقوف یہ کرۂ ارض نہیں ہے۔ یہ تجھ جیسے اندھوں کے خیالات اور کوششوں کا نقشہ ہے۔ قوموں کی ترقی و تنزل کا نقشہ ہے۔ انسان کی پستی اور بلندی کا نقشہ ہے۔ روحانیت

---

۵۱ اقبال کی تابندگی کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی۔

۵۲ دل بائیں طرف ہی ہوتا ہے۔

۵۳ پہلے زمین کو سطح سمجھتے تھے۔ جدید تحقیقات نے اسکو گول کر دیا مزا یہ ہے کہ دونوں فریق اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں دیکھا کسی نے نہیں۔ صرف عقلی دلائل سے ایک دوسرے کو دبانا چاہتے ہیں۔ چند ہی روز ہوئے کہ جرمنی کے ایک مشہور پروفیسر زمین کے کونوں کی تلاش میں نکلے ہیں۔ ہماری رائے میں اگر آدھی زمین کو چپٹا اور آدھی کو گول مان لیا جائے تو جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔

اور مادہ پرستی کے مقابلہ کا نقشہ ہے۔ غرض یہ سمجھ لے کہ خیر و شر کا نقشہ ہے۔ تجھے یوں کیا خاک سجھائی دے گا۔ لے میری آنکھ سے دیکھ"۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میری آنکھوں میں خود بخود ایک عجیب قوت پیدا ہو گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گنبد کی ڈھلان پر انسانوں کے گروہ کے گروہ اور انبوہ کے انبوہ چڑھے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ چڑھتے ہیں۔ کچھ پھسلتے ہیں۔ کچھ آگے بڑھتے ہیں کچھ پیچھے ہٹتے ہیں۔ بعض[1] ایسے ہیں کہ ہمت اونچے چڑھ گئے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ بیچ ہی ہمت ہار بیٹھے ہیں بہت ایسے ہیں کہ نیچے ہی کھڑے اچک رہے ہیں۔ گنبد کے نچلے حصّہ کو جو میں نے ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں اس گنبد کے اوپر بھی ایک گنبد تھا۔ شروع دونوں ایک ہی جگہ سے ہوئے تھے۔ مگر زمانہ کے ہاتھوں بڑا گنبد سارے کا سارا ٹوٹ کر صرف کنارے رہ گئے تھے میں نے اپنے رہبر سے پوچھا "اجی حضرت یہ اوپر والا گنبد کہاں گیا" فرمایا "میاں اس دوسرے گنبد کی کچھ نہ پوچھو۔ وہ گنبد تمہارے سامنے والے گنبد سے کہیں بڑا تھا۔ اس کا کلس گنبد گردوں سے گزر کر عرش کے کنگروں سے جا ملا تھا۔ اس کا نام روحانیت کا گنبد تھا۔ دنیا والوں نے اس کی دیکھ بھال نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹھ گیا۔ اب صرف مادہ پرستی کا گنبد حباب آسا رہ گیا ہے۔ جب وہ نہ رہا تو یہ کیا رہیگا۔ بڑا گنبد فولاد کا تھا وہ اس شیشہ کے گنبد کو آسیب بلا سے بچاتا تھا۔ اب روحانیت کا سایہ دنیا سے اٹھ گیا۔ کوئی دن جاتا ہے کہ مادہ پرستی کا یہ نازک اور پرشکوہ گنبد بھی حوادث زمانہ سے پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائیگا۔

پہلے زمانہ کے لوگ دونوں گنبدوں پر ایک ساتھ چڑھتے اور دنیا کو دین سے جدا نہ کرتے تھے۔ یہاں بھی اچھے رہتے۔ وہاں بھی اچھے رہتے۔ اب دنیا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ دین کو بالکل بھول گئے۔ نتیجہ دیکھ لے۔ رفتہ رفتہ گنبد روحانیت تباہ ہو گیا۔ کچھ کگریں رہ گئی ہیں وہ بھی آگے چل کر اس چھوٹے گنبد میں ملجاتی ہیں۔ اب اگر کوئی روحانیت کا راستہ اختیار کرتا بھی ہے۔ تو تھوڑے دنوں بعد دنیا داروں میں آملتا ہے غرض اب دنیا ہی دنیا رہ گئی۔ سمجھے ہوئے ہیں کہ۔

عاقبت کی خبر خدا جانے   اب تو آرام سے گزرتی ہے

---

[1] ترقی یافتہ لوگ بہت کم ہیں۔ اور غیر ترقی یافتہ قومیں بہت زیادہ۔

میں نے پوچھا "حضرت آخر اس نئے نمونہ کا گنبد بنانے میں بھی کوئی راز ہے" کہنے لگے "ہاں - راز ہے اور بہت بڑا راز ہے - بات یہ ہے کہ ہر قوم ستارہ اقبال تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جب انتہائی ترقی کو پہنچ جاتی ہے اور غرور کے نشہ میں بدمست ہو کر آنکھیں بند کر کے پاؤں آگے ڈالتی ہے تو تنزل کی ڈھلان پر سے لڑھکتی ہوئی گمنامی کے غار میں جا پڑتی ہے پھر اٹھتی ہے - سنبھلتی ہے - ترقی کے مدارج طے کرتی ہے - اور پھر ادبار کی ذلتیں اٹھا کر "رفتگاں" کی فہرست میں داخل ہو جاتی ہے" میں نے پوچھا - "پیرومرشد جب خدا نے ہر انسان کو وہی ہاتھ دئے اور وہی پاؤں - وہی اعضا عنایت کئے اور وہی عقل تو پھر بڑھنے کے وقت انکے آگے پیچھے رہنے کی کیا وجہ ہے" فرمایا "مجھ سے کیا پوچھتا ہے - تو خود دیکھ لے" اب جو میں نے غور کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ دوسروں کے کندھوں پر کھڑے ہو کر اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں نیچے والے ہیں کہ بوجھ سے دبے جاتے ہیں - اوپر والے ہیں کہ تعریفوں سے ہمت بڑھاتے ہیں - یہ پھر شکریہ کے ہاتھ سے اپنی پیشانیوں کا پسینہ پونچھتے ہیں اور ان بھاری بھاری لاشوں کو اٹھاتے ہیں - میں نے اپنے رہبر سے کہا "حضرت یہ عجیب بیوقوف لوگ ہیں - خود تو بڑھتے نہیں دوسروں کو بڑھا رہے ہیں - اگر ترقی ہی مقصود ہے تو خود ترقی کریں یہ کیا کہ محنت تو کریں یہ اور فائدہ اٹھائیں دوسرے" فرمایا "ہاں - مادہ پرست دنیا میں یونہی ہوتا ہے - چھوٹے - بڑوں کو بڑھاتے ہیں اور خود فنا ہو جاتے ہیں - البتہ روحانیت کے گنبد میں اسکے خلاف عمل تھا - جو خود اوپر چڑھا وہ نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیتا - اور اسطرح یہ زنجیر کی زنجیر میدان روحانیت میں آگے بڑھتی چلی جاتی" وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ میری نظر کچھ اڑتے ہوئے پرچوں پر پڑی - کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گروہ کا گروہ کتابیں بغل میں دبائے گنبد پر چڑھا جا رہا ہے جہاں ذرا ان کا پاؤں پھسلا کہ انہوں نے کتاب میں سے چند ورق پھاڑ - ہوا میں اڑا دئے اور اس طرح کچھ ہلکے ہو - آگے قدم بڑھایا - میں نے بڑے بیان سے پوچھا - "اجی جناب - انکو اپنے ساتھ

له سچ ہے پستی - ترقی کا اور ترقی - پستی کا زینہ ہے - ابتدائے آفرینش سے قومیں اسی اتار چڑھاؤ کی منزلیں طے کرتی رہی ہیں اور قیامت تک کرتی رہینگی - آج جو قوم بلندی پر ہے وہ کل گر گی اور جو گری ہوئی ہے وہ بلند ہو گی -

کتابوں کے یہ گٹھڑ لانیکی کیا ضرورت تھی۔ خالی ہاتھ آئے ہوتے جو اس پھسلوان گنبد پر چڑھنے میں آسانی ہوتی۔ اور جب یہ کتابیں ان کو ایسی ہی عزیز ہیں کہ یہاں لاد لاد کر لائے ہیں تو اب ان کو پھاڑ پھاڑ کر پھینکنے کا کیا مطلب ہے۔ بوجھ کا بوجھ رہا۔ اور کتابیں ستیاناس ہو گئیں " ہنسکر کہنے لگے "یہ اہل قلم اور اخبار نویسوں کا گروہ ہے۔ انکی ترقی کا دارومدار انہی کاغذ کے پرزوں پر ہے۔ اگر انکی تحریر کو لوگوں نے پسند کیا تو چڑھنے میں ذرا سہارا دیدیا۔ اگر کوئی حصہ ناپسند ہوا تو انہوں نے اتنا حصہ پھاڑا اپنی رائے کو بدل مضمون کا رخ کچھ اسطرح پھیر دیا کہ انکی ترقی کا باعث بن گیا۔ جو اہل قلم اسپر عمل نہیں کرتے وہ بے سہارا ہونے کی وجہ سے گرتے ہیں اور اپنی ہی کتابوں کے انبار کے نیچے دبکر فنا ہو جاتے ہیں خیر یہ تو جو کچھ ہیں وہ ہیں۔ ذرا ان کے برابر والوں کو بھی دیکھ" ادھر جو دیکھتا ہوں تو عجیب تماشہ ہے۔ گروہ کے گروہ ہیں کہ گنبد پر چڑھتے بھی جاتے ہیں اور لڑتے بھی جاتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ یہ چڑھائی دیکھئے اور انکی احمقانہ حرکت ملاحظہ کیجئے۔ ایسے چکنے گنبد پر چڑھنا خود ہی کٹھن ہے۔ بھلا یہ آپس کی دھینگا مشتی کیا کچھ غضب نہ ڈھائیگی میں نے پوچھا " اجی حضرت۔ یہ کیا ہو رہا ہے" بولے "ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن کا نقشہ ہے ہاں ان میں جو سمجھدار ہیں وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک دوسرے کو کھینچتے کھینچاتے بہت دور نکل گئے ہیں۔ یہ جو مقطع صورتیں آپسمیں دست و گریبان ہیں یہ قوموں کے دینی پیشوا ہیں۔ انکی یہ خوبی ہے کہ صرف دوسرے مذہب والوں ہی کو نہیں نوچتے کھسوٹتے اپنے ہم مذہبوں کو بھی لہولہان کئے دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے ترقی روحانیت کے گنبد سے شروع کی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ مادیت کے گنبد پر نکل آئے۔ اور اپنے مصلے۔ سجادے اور مرگ چھالے خانقاہوں۔ کلیساؤں اور شوالوں سے اٹھا کر کانگریس کے منڈپوں۔ تجارتی کانفرنسوں اور کمیشنوں کے اجلاسوں پر لا بچھائے تعلیم کچھ پائی تھی۔ لگے دوسرے کام میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ادھر کے رہے اور نہ ادھر کے رہے یہی وہ لوگ ہیں جنکے متعلق خسر الدنیا والآخرہ فرمایا گیا ہے"

میرے رہبر تو ان دنیوی دینداروں کی مذمت میں لگے ہوئے تھے اور میں اس گنبد کے چڑھنے والوں کے ایک دوسرے گروہ کا تماشہ دیکھنے میں مشغول تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آدمی ہیں یا ربڑ کے گولے۔ کچھ لوگ ہیں کہ نیچے کھڑے انہیں پھونکیں مار رہے ہیں ان گول مول انسانوں

کے قدم خود تو گنبد کی ڈھلان پر ٹکتے نہ تھے ہاں صرف ہوا کے زور سے یہ کبھی اوپر جاتے تھے۔ کبھی نیچے آتے تھے۔ اسی الٹ پلٹ میں شاید خیال کرتے ہونگے کہ ستارۂ اقبال تک اب پہنچے اور اب پہنچے۔ میں نے اپنے خضر راہ سے کہا "پیرو مرشد یہ کیا تماشہ ہے۔ یہ لوگ پھول کر کپّا کیوں ہو گئے ہیں۔ پھونک کے بل پر اُڑ رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اتنی اونچان سے گرے تو کیا حال ہوگا" فرمایا "دو بیٹا جو لوگ نیچے کھڑے پھونکیں مار رہے ہیں۔ یہ خوشامدی ہیں۔ اور جو ہوا میں اُڑ رہے ہیں وہ خوشامد خورے۔ موٹاپے نے ان کی چشم حقیقت بین بند کر دی ہے۔ اور گوش خوشامد نیوش کھول دئیے ہیں۔ خود تو کچھ دکھائی دیتا نہیں۔ ہاں دوسروں سے یہ سُن سُنکر آپے سے باہر ہوئی جاتی ہیں کہ ہم سے آگے کوئی نہیں۔ جب تک خوشامدی ان کی چاپلوسی میں اپنی ترقی دیکھنگے اسوقت تک انکو یونہی پھونکیں مار مار کر اڑاتے رہینگے۔ جب جب منفعت کی صورت نہ رہیگی اسوقت انکو چھوڑ کر کسی دوسرے خوشامد خورے کے ساتھ ہو جائینگے۔ اور پہلے صاحب اس بلندی پر سے گر کر پاش پاش ہو جائینگے" میں نے عرض کی "جناب اگر یہ توپ کا گولہ لڑھکا تو کوئی خوشامدی خوری اس کی لپیٹ میں آجائینگے" کہنے لگے "نہیں۔ یہ خوشامدی بڑے پختہ کار لوگ ہوتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ کسی خوشامد خورے کا وقت آن لگا ہی تو جھٹ ادھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔ آپ بچ جاتے ہیں اُسکو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ خیر یہاں تو کھڑا کھڑا کہاں تک اور کیا کیا دیکھیگا۔ ان سب لوگوں کی حالت کو دیکھنے اور سمجھنے کیلئے عمر نوح چاہیئے۔ چل۔ میرے ساتھ چل۔ تجھے کچھ گنبد کے اندر کا بھی تماشہ دکھلا لاؤں۔" میں نے کہا "میں۔ تو کیا یہ گنبد اندر سے کھوکھلا ہے" فرمایا "ہاں۔ اور کیا تو نے مادیت کو کوئی ٹھوس چیز سمجھا ہے۔ باہر تو صرف ٹپلیاں ہیں۔ اس کے کل پرزے تو سب اندر ہی ہیں۔ اندر ہی سے پچکاریاں دے دے کر ان کو قوت پہنچائی جاتی ہے ورنہ انسان کی قدرت ہے کہ شیشہ کی ایسی ڈھلان پر ایک قدم ٹھہرتا تو کجا ایک لمحہ ٹک بھی سکے" میں نے کہا "بہت خوب چلیئے" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھے اور بات کی بات میں ہم دونوں دیوار میں سے اسطرح گزر گئے جیسے شیشہ میں سے نگاہ۔ اندر جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ اس سرے سے اُس سرے تک کارخانے ہی کارخانے پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک ایک کارخانہ بلندی میں آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ اور اپنی وسعت سے وسعت خیال کو شرماتا ہے۔ ہمارے سامنے ہی جو کارخانہ تھا۔ اس پر بہت بڑے بڑے سیاہ حرفوں میں لکھا

ہوا تھا "کارخانہ جراثیم آوارگی"۔ بڑے میاں نے مجھ سے اندر چلنے کو کہا۔ میں نے تامل کیا۔ انہوں نے فرمایا "اب آیا ہے تو چل دیکھ لے ہر کسی کو یہ چیزیں دیکھنی نصیب تھوڑی ہوتی ہیں"۔ میں نے عرض کی "حضرت۔ معاف کیجئے اور جو یہ جراثیم مجھ میں سرائیت کر گئے۔ تو پھر میرا کہاں ٹھکانہ رہیگا" کہنے لگے "یہ بھی خوب کہی کہ کہاں ٹھکانہ رہیگا۔ بیٹا فیشن ایبل ہو جاؤ گے قوم کے لیڈر بن جاؤ گے دنیا میں نام ہوگا۔ کچھ کما کھاؤ گے۔ صرف زبانی جمع خرچ میں ساری عمر چین سے گزر جائیگی۔ میاں۔ آوارہ ہونے کو بھی ہمت چاہئے۔ تمہارا اندر قدم رکھنے سے دم نکلتا ہے بھلا آوارہ بننے کی ہمت کہاں سے لاؤ گے"۔ میں نے کہا "بہت خوب۔ چلئے" اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں سے وہاں تک شیشے کی دیگیں چولھوں پر چڑھی ہیں۔ مرد اور عورتوں کا لشکر جم غفیر ننگا اپنے اپنے کام میں لگا ہے۔ کوئی دیگوں میں عرق ڈال رہا ہے۔ کوئی چولہوں میں ایندھن ٹھونس رہا ہے۔ ڈاکٹر ہیں کہ مقیاس الحرارت ہاتھوں میں لئے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھر رہے ہیں۔ کبھی اس دیگ کو دیکھتے ہیں۔ کبھی اس دیگ کو۔ کسی سے کہتے ہیں اس میں اور عرق ڈالو۔ کسی کو حکم دیتے ہیں کہ اس کے نیچے اور آنچ لگاؤ۔ کسی دیگ کو اتار ٹھنڈا کرنے کیلئے رکھ دیتے ہیں۔ کسی اتری ہوئی دیگ کو چڑھا دیتے ہیں۔ غرض ہر شخص اپنے اپنے کام میں اسطرح مشغول ہے کہ دنیا و ما فیہا کی کچھ خبر نہیں۔ ایک طرف تیار شدہ سیرم (عرق) کی شیشیاں بھر کر سربمہر کیجا رہی ہیں۔ ایک طرف پارسل بندھ کر روانہ ہو رہے ہیں۔ میں نے بڑے میاں سے پوچھا "جناب یہ سب کے سب ننگے کیوں ہیں" فرمایا "خدا اس آگ کی گرمی سے بچائے۔ کپڑے کا ایک تار بھی جسم پر ہو تو جل کر راکھ ہو جائے"۔ میں نے کہا "حضرت۔ اس عرق کا بیان بہت خرچ معلوم ہوتا ہے۔ پیسے کے پیسے اُٹھے جا رہے ہیں اور رس نہیں ہوتا"۔ کہا "یہ عرق نہیں شراب ہے۔ آوارگی کے جراثیم کی پرورش اور پختگی کیلئے یہی اکسیر کا کام دیتی ہے۔ کوئی تیرہ سو برس ہوئے جب اس کارخانہ کو ایک بڑی مصیبت کا سامنا ہو گیا تھا۔ دنیا کے ایک بڑے حصہ نے شراب کو ممنوع قرار دیکر اس کی آمد کو بالکل روک دیا تھا۔ اگر کچھ دنوں وہی رنگ رہتا تو اس کارخانہ کا دیوالہ نکلنے میں کسر نہ رہی تھی۔ مگر اس کارخانہ کا مالک بھی آفت کا پرکالہ ہے۔ ہوس کے کارخانہ والوں سے مل ملا "عزت و جاہ کے جراثیم" دیندار وں کے خون میں پہنچا دئے نتیجہ یہ ہوا کہ احکام کی تاویلیں شروع

ہوئیں اور یہ کارخانہ سنبھل گیا - اب تھوڑے دنوں سے تو یہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے"۔ میں نے یہ دیکھ کر کہ چولھوں میں بجائے ایندھن کے کپڑے ہی کپڑے جل رہے ہیں - اپنے رہبر سے پوچھا "حضرت - کیا یہ مادہ صرف کپڑوں ہی سے پکتا ہے" کہنے لگے "ہاں - اس کی پکانے میں عصمت کی چادریں - عفت کے برقعے اور حیا کی نقابیں جلانی پڑتی ہیں - کسی زمانہ میں اس ایندھن کا بھی کال ہو گیا تھا مگر اب تو یہاں خرچ سے زیادہ آمد ہے - تجربہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ ستر پوشی کے کپڑے ان کپڑوں کے تیار کرنیکا سب سے اچھا ایندھن ہیں - کبھی کبھی یہ چیزیں بھی آجاتی ہیں[1] مگر کم - اگر اس کارخانہ کی قسمت میں ترقی لکھی ہے تو اسکی بھی کمی نہ رہے گی - اچھا چلو اب دوسرا کارخانہ کو دیکھیں" یہاں سے نکلکر ہم دوسری عمارت کے پاس پہنچے - اس پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا "سچ اور جھوٹ کے جراثیم کا مشترکہ کارخانہ" میں نے کہا "جناب والا - یہ تو علیحدہ علیحدہ کارخانے ہونے چاہئے - یہ ملے ہوئے کیوں ہیں" فرمایا "ہاں پہلے یہ دونوں الگ الگ ہی تھے "سچ کا کارخانہ" ٹوٹنے لگا تو "جھوٹ کے کارخانہ" کو شریک کر لیا گیا - بات یہ ہے کہ سچ کے جراثیم ایسے تلخ ہیں کہ لوگ انکی برداشت نہیں کر سکتے - جھوٹ کے جراثیم کی آمیزش سے ایک نیا کیڑا پیدا ہو گیا ہے اسکو یہاں کی اصطلاح میں "دروغ مصلحت آمیز" کہتے ہیں - اس کا سیرم دنیا والوں کو کچھ ایسا راس آیا ہے کہ کیا بیان کروں - بنڈل کے بنڈل چلے جا رہے ہیں - اور بس نہیں ہوتے - اس سے بڑے یہاں صرف دو ہی کارخانہ ہیں ایک "ہوس" کا اور دوسرا "ریاکاری" کا - ریاکاری کے جراثیم کا تو یہ حال ہے کہ جب تک انکو شریک نہ کیا جائے کوئی سیرم تیار ہی نہیں ہوتا - پہلے یہاں "قناعت" کا بھی ایک بڑا کارخانہ تھا - مگر اب اسکو "ہوس" کے کارخانہ نے خرید لیا ہے - "انصاف کا کارخانہ" "دولت کے کارخانہ" کے ہاتھ آگیا - اور "نیکی کا کارخانہ" ریاکاری کی کمپنی میں ضم ہو گیا - پہلے زمانہ میں دینداری کے سیرم کی سب سے زیادہ مانگ تھی - مگر جب سے روحانیت کا گنبد تباہ ہوا ہے اسوقت سے اس سیرم کو کوئی پوچھتا بھی نہیں - اس کا کارخانہ برائے

---

[1] ایک پوری قوم نے سارا لباس اتار پھینکا ہے - ابھی تھوڑے دن ہوئے یورپ کے ایک ہوٹل میں ایک بیگم صاحبہ مادر زاد ننگی تشریف لائی تھیں - دوسری ہیں کہ ہم ننگی ناچتی ہیں -

نام چل رہا ہے۔ جو تھوڑا بہت مال تیار ہوتا ہے اس میں بھی ریاکاری کے جراثیم شریک کرنے پڑتے ہیں
خالص مال کی نکاسی اس زمانہ میں بالکل بند ہے۔ اچھا تو یہاں کیوں کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھو۔ اگر یونہی
ہر جگہ ٹھٹھکا۔ تو ساری عمر بھی ان کارخانوں کے دیکھنے کے لیے کافی نہ ہوگی۔" یہ سنکر میں نے آگے قدم
بڑھایا۔ اب جس عمارت کے سامنے ہم پہنچے۔ اسکی وسعت کچھ نہ پوچھو۔ ساری دنیا اسکے ایک کونے میں
سما جائے۔ اور آسمان اسکی چھت کے نیچے آ جائے۔ عمارت کی روکار پر بڑے بڑے خوبصورت
سنہری حرفوں میں لکھا ہوا تھا "کارخانہ ہوس" اس کارخانہ کی ہزاروں شاخیں تھیں۔ کسی پر تختی
لگی تھی "شاخ جاہ و مرتبت" کسی پر لکھا تھا "شاخ جوع الارض" ایک سائن بورڈ پر تھا "شاخ
ملازمت" میں نے اپنے رہبر سے کہا "چلیے۔ اسے دیکھیں۔ یہ بڑی دلچسپ شاخ معلوم ہوتی ہے"
کہنے لگے "چلو۔ دیکھ لو۔ ہوس کے کارخانہ کی یہ شاخ ہمیشہ سے خوب چل رہی ہے۔ ہاں آج کل
ہندوستان میں اس سیزم کی سب سے زیادہ مانگ ہے۔" اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہی دیگیں
پر دیگیں چڑھی ہیں سوکھے سہمے آدمی چولھوں میں تعلیمی ڈگریاں۔ سفارشی رقعے اور مدحی قصیدے
دھڑا دھڑ پڑے جلا رہے ہیں۔ بھلا کاغذ کی کیا بساط۔ آگ ذرا بھڑکی اور ٹھنڈی ہو گئی۔ انہوں نے
پھر کاغذوں کے بنڈل لیے اور چولھے میں رکھ دیے۔ بیحیائی کی پھکنی سے خوشامد کی پھونکیں ماریں
پھر ذرا شعلہ اٹھا اور دھیم ہو کر رہ گیا۔ میں نے اپنے رہبر کی طرف پھر کر دیکھا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے
"یہ مادہ ذرا مشکل سے پکتا ہے۔ ایک انار و صد بیمار کا مضمون ہے۔ مانگ بہت ہے۔ مال کم تیار
ہوتا ہے۔ بعضوں کو ملتا ہے۔ بعض مانگتے ہی مانگتے ختم ہو جاتے ہیں۔ جو خالی ہاتھ رہتے تھے اب
انہوں نے "شورش کے جراثیم" کی پچکاریاں لینی شروع کر دی ہیں۔ پچکاریاں لیتے ہیں اور مادیت
کے گنبد کو کھودتے ہیں۔ پھر لیتے ہیں۔ پھر کھودتے ہیں۔ ایک دن آنیوالا ہے کہ انہی کے ہاتھوں
اس گنبد کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ روحانیت پہلے ہی جا چکی۔ اب مادیت بھی رخصت ہو جائیگی۔ نتیجہ یہ
ہوگا کہ انسانیت سے نکل کر سب کے سب پھر وہی جنگلی کے جنگلی ہو جائینگے۔" میں نے کہا "خیر دیکھا جائیگا
میں یہاں سے جاتے ہی سارا بھانڈا پھوڑے دیتا ہوں۔ اچھا ہوا کہ میں یہاں آ گیا۔ نہیں تو دنیا ہی تباہ
ہو جاتی۔" یہ کہہ میں وہاں سے بھاگا۔ بڑے میاں نے غل مچایا "ارے بھائی۔ ذرا ٹھیر۔ یہاں کا
کچھ اور رنگ بھی دیکھتا جا۔" میں نے کہا "بس حضرت۔ بس۔ بہت کچھ دیکھ لیا۔ مجھے پہلے ان شور پشتوں

حضرات کا انتظام کرنا ہی! ابھی سے روک تھام نہ کی تو یہ اپنے ساتھ ساری دنیا کو لے مرینگے" وہ چیختے ہی رہے کہ میاں کیوں دیوانہ ہوا ہے - تیری کون سنتا ہے - بیسیوں ان کارخانوں کو دیکھکر جا چکے ہیں - وہاں جا کر بہت کچھ غل مچایا - مگر ان کی آواز نقارخانہ میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی - وہاں تو دو ہمارے ہی سے جرائم اتنے ٹھونس دئے گئے ہیں کہ تجھ جیسے اگر ہزار سمجھ دار بھی اودھم مچائیں تو سب کو بیوقوف سمجھیں اور پاگل خانہ پہنچا دیں" بڑے[1] میاں نے پہلے سمجھایا - خوشامد کی جب دیکھا کہ یہ کسی طرح نہیں مانتا تو لپک کر میرا دامن پکڑ لیا - مجھے بہت برا معلوم ہوا - دبا کر ایک ٹھوکر رسید کی - ٹھوکر کے بادل ایسا جھنسا یا کہ آنکھ کھل گئی - اب جو دیکھتا ہوں تو سامنے میز الٹی پڑی ہے اور میں بیٹھا اپنا پنجہ دبا رہا ہوں - خیر جو ہوا سو ہوا دنیا کا موجودہ نقشہ تو دیکھ آیا -

زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں - زندہ دلی اور مردہ دلی - ایک وہ لوگ ہیں جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں - دوسرے وہ ہیں جو خوشی میں بھی روتے ہیں - ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں اور دوسرے جینے کو مرنا - زندگی کے انہی دونوں پہلوؤں نے کبھی مذہب کی شکل اختیار کی اور کبھی فلسفہ کے مکتبوں کی صورت - غرض دنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا - ایک روتی صورت دوسرے ہنستی مورت - کوئی انسان بنا اور کوئی تیر -

پہلے زمانہ کے لوگوں کا کیا کہنا - وہ تو بچوں کو شروع ہی سے سکھاتے تھے کہ ہنستے کھیلتے عمر گزار دو - کہانیاں لکھتے تھے تو ایسی کہ بچوں کو زندہ دلی سے محبت اور مردہ دلی سے نفرت ہو - پرانے قصے کہانیاں اب خود قصہ کہانیاں ہو گئیں - انکو اس لئے چھوڑ بیٹھے کہ پرانی ہر بات فضول ہے - خیر کوئی سنے یا نہ سنے ہم تو ایک پرانی وضع کی کہانی لکھے دیتا ہوں - ذرا دیکھنا کس خوبی سے زندگی کے دونوں پہلو دکھا کر زندہ دلی کی ترغیب دی ہے -

گرمی کا موسم ہے چاندنی رات ہے - صحن میں پلنگ بچھے ہیں کھانا وانا کھا کر سب ابھی لیٹے ہیں

---

[1] - سچ ہے دل ہر طرح سمجھاتا ہی - خوشامد کرتا ہی - خفا ہوتا ہی - سرزنش کرتا ہی لیکن سب اسکی باتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور آخر نقصان اٹھاتے ہیں -

ایک پلنگ پر دو لڑکیاں سعیدہ اور حمیدہ لیٹی کھسر پھسر کر رہی ہیں۔ دوسرے پلنگ پر ان کے دو چھوٹے بھائیوں احمد اور محمود میں کشتم کشتا ہو رہی ہے۔ ان کی والدہ تختوں پر جانماز بچھائے عشاء کی نماز پڑھ رہی ہیں۔ ان کی نانی نے ابھی نماز سے فارغ ہو کر پاندان کھولا ہے۔ پاندان کی آواز سنتے ہی احمد اور محمود لڑائی وڑائی چھوڑ پلنگ سے اُٹھے اور نانی سے آکر لپٹ گئے احمد نے کہا "نانی اماں کہانی" محمود نے کہا "ہاں نانی اماں کہانی" یہ سننا تھا کہ سعیدہ اور حمیدہ بھی اُٹھ بیٹھیں اور انہوں نے بھی نانی سے کہانی کا تقاضہ کیا۔ بڑی بی بہت کچھ کہتی رہیں "ارے بھئی میرے سر میں درد ہے۔ کل کہونگی۔ دیکھو غل نہ مچاؤ تمہاری اماں کی نماز میں ہرج ہوتا ہے" مگر کون سنتا تھا۔ آخر گھسیٹ گھساٹ بڑی بی کو پلنگ پر لا ہی بٹھایا۔ دو ایک پہلو میں لیٹ گئے دو دوسرے پہلو میں۔ اور اب بحث شروع ہوئی کہ کونسی کہانی کہی جائے۔ میاں محمود سب سے چھوٹے تھے انکا اصرار تھا کہ طوطا مینا کی کہانی کہو۔ لڑکیاں مصر تھیں کہ انی کنیتی کا قصہ سناؤ۔ بڑی بی پریشان تھیں کہ کونسی کہوں۔ کونسی نہ کہوں۔ آخر کہنے لگیں "تم سوچنے تو دیتے ہی نہیں۔ کہوں تو کیا خاک کہوں ذرا دم لو۔ میں سوچ تو لوں" یہ سن کر بچے چپ ہوئے بڑی بی نے دماغ پر ذرا زور دڈالا۔ اور اسطرح کہنا شروع کیا۔

"تو ہاں بھئی خدا تمہارا بھلا کرے ایک تھی بڑھیا۔ بچاری کے ایک ہی بچہ تھا۔ مصیبت کی ماری سارے دن سوت کاتتی شام کو جا کر گدڑی میں بیچ آتی۔ دینا بنیئے کے ہاں"

سعیدہ۔ "نانی اماں! وہی دینا۔ نا۔ جس کے ہاں سے ہمارا اناج آتا ہے"

احمد۔ "نانی اماں! دینا۔ بودینہ۔ باجرہ کی روٹی۔ لٹا مہینہ"

بڑی بی نے بچوں کو ڈانٹا کہ "نہ تم سنتے ہو۔ نہ کہنے دیتے ہو چلو جاؤ۔ اپنی اماں سے جا کر کہانی سنو وہ نماز پڑھ چکی ہیں تمھیں سننا ہی تو چپکے لیٹے رہو" خیر پھر اقرار مدار ہوا اور بڑی بی نے کہا "ہاں میں نے کہاں تک کہا تھا"

حمیدہ۔ "دینا بنیئے کے ہاں سے"

بڑی بی۔ "ہاں۔ دینا بنیئے کے ہاں سے تھوڑی سی دال۔ تھوڑا سا آٹا۔ تھوڑا سا نمک مرچ لاتی پکاتی۔ خود کھاتی۔ بچے کو کھلاتی۔ اسیطرح کئی برس گزر گئے۔ بچہ خاصہ سیانا ہو گیا"

احمد۔ "نانی اماں! سیانا کیا؟

نانی ”سیانا یعنے بڑا ۔ ہوشیار“

میاں محمود جوش میں آکر اُٹھ بیٹھے اور کہا ”نانی اماں جیسے ہیں“ بہنوں نے میاں محمود کو پکڑ دھکڑ زبردستی لٹا دیا ۔ اور پھر کہانی شروع ہوئی ۔

نانی ”جب ذرا سیانا ہوا ۔ تو میاں جی کے پاس پڑھنے بٹھایا“

احمد ”نانی اماں! تختی پہ تختی ۔ میاں جی کی آئی کم بختی“

نانی ”نا ۔ بیٹا ۔ ایسی بری باتیں نہیں کیا کرتے ۔ مولوی صاحب باپ کے برابر ہوتے ہیں“

انکو بھی بھائی بہنوں نے زبردستی خاموش کیا ۔ اور کہانی کا پھر سلسلہ چھڑا ۔

نانی ”بھئی وہ لڑکا تو ایسا نکلا ۔ ایسا نکلا ۔ کہ سبحان اللہ تھوڑے ہی دنوں میں پڑھ پڑھا خاصہ مولوی ہوگیا ۔ عرضی پرزہ کرکے کچہری میں دس پندرہ روپئے کا نوکر بھی ہوگیا ۔ اب بڑی بی کے دن پھرے ۔ اچھے اچھے کھانے پکاتیں ۔ اچھے اچھے کپڑے بناتیں ۔ مزے سے دونوں ماں بیٹے رہتے ۔ جب ہوتے ہوتے تھوڑا بہت روپیہ بھی جمع ہوگیا ۔ تو بڑی بی کو بچے کی شادی کی سوجھی ۔ ڈھونڈھ ڈھانڈ کر ایک لڑکی چندے آفتاب چندے مہتاب بیاہ لائیں ۔ بڑے چاؤ سے بہو کو گھر میں اتارا ۔ اچھے سے اچھا کھانا بہو کو کھلاتی ۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہناتی ۔ مگر بہو تھی کہ کوئی چیز اسکو بھاتی ہی نہ آتی تھی ۔ جب تک گھونگھٹ رہا اس وقت تک تو کسی نہ کسی طرح گزرے گئی گھونگھٹ اٹھنا تھا کہ ساس پر مصیبت آگئی ۔ زبان سے ہوتے ہوتے ہاتھ پر اتر آئی ۔ خود ہی بڑھیا کو مارتی اور خود ہی ٹسوے بہانے بیٹھ جاتی ۔ خاوند سے وہ وہ لگائی بجھائی کی کہ ایک دن بیٹے نے بھی ماں کو خوب مارا“

حمیدہ اچھل پڑی اور کہا ”اے ہے ماں کو مارا ۔ موئے کو بڑھیا پر ہاتھ اٹھاتے شرم بھی نہ آئی“

نانی ”ہاں بیٹا ۔ اچھی بیٹیاں ساس کو ماں کے برابر سمجھتی ہیں ۔ نوج دور پار اگر شریفوں کی بہو بیٹیاں ایسی باتیں کرنے لگیں تو پھر شریفوں اور چوہڑے چماروں میں کیا فرق رہ جائے ہاں تو بیٹے نے مار پیٹ بڑھیا کو گھر سے نکالدیا“

محمود ”اور ہلدی چونا نہیں لگایا“

نانی۔ "ہلدی چونا لگانا ہوتا تو مارتے ہی کیوں۔ تو خیر بچاری بڑھیا۔ روتی۔ رلاتی جنگل بیابان میں جہاں نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک بڑ کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔ اور لگی منہ ڈھانک ڈھانک کر رونے خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ انہی دنوں میں جاڑا۔ گرمی۔ برسات میں جھگڑا ہوا۔

جاڑا کہتا میں اچھا۔ گرمی کہتی میں اچھی۔ برسات کہتی میں اچھی۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ چلو چلکر کسی آدم زاد سے پوچھیں۔ انکا جو ادھر گذر ہوا۔ تو تینوں نے کہا "لو بھئی وہ سامنے ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی ہے چلو اس سے پوچھیں"

سب سے پہلے میاں جاڑے آئے۔ گوری گوری رنگت۔ گلے ایسے۔ جیسے انار کا دانہ سفید داڑھی۔ موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے۔

حمیدہ۔ "نانی اماں! وہ کہاوت کیا ہے۔ دگلہ سب سے اگلا۔"

نانی۔ "دگلہ سب سے اگلا۔ پہنو تو گرم۔ بچھاؤ تو نرم۔ باندھو تو لغچی کا بھرم۔

تو ہاں۔ موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے۔ خوب اوڑھے لپیٹے آئے۔ انکا آنا تھا کہ بڑی بی کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ میاں جاڑے نے آکر کہا "بڑی بی سلام" بڑی بی نے کہا۔ "بیٹا۔ جیتے رہو۔ بال بچے خوش رہیں۔ مگر بیٹا ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ مجھے تو تمہارے آنے سے کپکپی سی لگ گئی ہے" خیر میاں جاڑے ذرا ہٹ کر کھڑے ہوگئے اور کہا "بڑی بی ایک بات پوچھوں" بڑی بی نے کہا "ہاں بیٹا ضرور پوچھو" میاں جاڑے نے کہا "بڑی بی جاڑا کیسا ہے" بڑی بی نے کہا "بیٹا جاڑا۔ جاڑے کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ مہاوٹ برس رہے ہیں۔ دالانوں کے پردے پڑے ہیں۔ انگیٹھیاں سلگ رہی ہیں۔ لحافوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ چائیں بن رہی ہیں۔ خود پی رہے ہیں۔ دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ صبح ہوئی اور چنے والا آیا۔ گرم گرم چنے لئے۔ پہلے بھرے پھولے چنے کھائے پھر گٹر گٹر ٹھنڈا پانی پیا۔ رہے ہیں۔ حلوا۔ پوریاں اڑ رہی ہیں۔ بچے ہیں کہ جیبوں میں چبینا ڈالے کھاتے پھر رہے ہیں۔ کابل سے طرح بہ طرح کے میوے آرہے ہیں۔ سب مزے لے لیکر کھا رہے ہیں۔"

سعیدہ۔ "نانی اماں! حلوا سوہن بن رہا ہے۔"

نانی۔ "ہاں۔ حلوا سوہن بن رہا ہے۔ گاجر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ باجرہ کا ملیدہ بن رہا ہے

رس کی کھیر پک رہی ہے - اِدھر سٹھیم خون ہے کہ چلیوں بڑھ رہا ہے - چہرے سرخ سرخ ہو رہے ہیں - بیٹیا جاڑا - جاڑے کا کیا کہنا - سبحان اللہ"

میاں جاڑے تھے کہ اپنی تعریفیں سن سن کر پھولے نہ سماتے تھے - جب بڑی بی چپکی ہو ئیں تو میاں جاڑے نے کہا "بڑی بی - خدا تمکو زندہ رکھے - تم نے میرا دل خوش کر دیا - یہ لو ایک ہزار اشرفی کی تھیلی - خرچ ہو جائے - تو اگلے جاڑے میں مجھ سے اور آکر لیجا نا"

میاں جاڑے ہٹے اور بی گرمی - مٹکتی ہوئی سامنے آئیں - کوئی ۱۵-۱۶ برس کا سن سرخ سرخ گال ان پر ہلکا ہلکا پسینہ - روشن آنکھیں - لمبی کالی چوٹی - گلے میں موتیا کا کنٹھا ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں - سر پر کرن ٹکی ہوئی باریک ہوا دُودیہ کی پیازی اوڑھنی - غرض بڑی شان سے آئیں اور آتے ہی کہا "نانی جان - سلام" بڑی بی نے کہا "بیٹیا جیتی رہو - بوڑھ سہاگن ہو - کہو - تم بھی کچھ پوچھنے آئی ہو - ابھی تمہارے ابا تو آکر پوچھ گئے ہیں" بی گرمی نے کہا "نانی جان وہ میرے ابا نہیں - بڑے بھائی ہیں - ہاں تو میں یہ پوچھنے آئی ہو کہ نانی جان گرمی کیسی" بڑی بی نے کہا "بیٹیا - گرمی - گرمی کا کیا کہنا - سبحان اللہ - دن کا وقت ہے - خس خانوں میں پڑے ہیں پنکھے جھلے جا رہے ہیں - کٹورے پر کٹورا شربت کا اڑ رہا ہے - بچوں کے ہاتھوں میں ہزارے ہیں ایک دوسرے پر چلا رہے ہیں - برف کی قلفیاں (قفلیاں) کھائی جا رہی ہیں فصل کے میوے آرہے ہیں پتلی پتلی ککڑیاں ہیں - لوکاٹ ہیں - آڑو ہیں"

حمیدہ - "نانی اماں! انگور ہیں - سیب ہیں"

نانی - "واہ بھئی واہ - انگور اور سیب جاڑے میں ہوتے ہیں یا گرمی میں - تم جب بولتی ہو تُکی بولتی ہو - ہاں تو شام کو اُٹھے - نہائے - دھوئے - سفید سفید کپڑے پہنے - خس کا عطر ملا گلے میں موتیا کے کنٹھے ہیں - ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں ہیں - صحن میں چھڑکاؤ ہو گیا ہے - گھڑونچیوں پر کورے کورے مٹکے رکھے ہیں - قلعی دار کٹہیروں پر سوندھی سوندھی صراحیاں جمی ہیں - گھڑوں اور صراحیوں کے منہ پر لال لال صافیاں لپٹی ہیں - ارد گرد کاغذی آبخورے لگے ہوئے ہیں سفالو اندر برف کا زور رہے - رات ہوئی - کوٹھوں پر پلنگ بچھ گئے - سفید سفید چادریں بچھی ہیں - اوپر پھول پڑے ہوئے ہیں خس کی پنکھیاں ہاتھوں میں ہیں - کوئی بھیگے ہوئے بان کے پلنگ پر پڑا

نور ٹپک رہا ہے"

احمد۔ "نانی اماں! کہانیاں ہو رہی ہیں"

نانی۔ "ہاں کہانیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ ہیں کہ رات کو خانیز پر جا رہے ہیں۔ خربوزے۔ تربوز۔ کھا رہے ہیں"

محمود۔ "کبڈی ہو رہی ہے"

نانی۔ "ہاں۔ کبڈی ہو رہی ہے۔ ریتی میں لوٹ رہے ہیں۔ صبح نہائے۔ دھوئے۔ مزے مزے گھر آ گئے۔ بیٹا۔ گرمی۔ گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ"

بی گرمی کا یہ حال تھا کہ تعریفیں سنتی جاتی تھیں اور نہال ہوئی جاتی تھیں۔ جب بڑی بی تعریفیں کرتے کرتے تھک کر چپ ہو گئیں تو بی گرمی نے چپکے سے نکال کر ایک ہزار اشرفی کی تھیلی ان کے ہاتھ میں دی اور کہا "نانی جان۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ آج تم نے میری لاج رکھ لی۔ ورنہ بڑے بھائی صاحب تو مارے طعنوں کے مجھے جینے بھی نہ دیتے۔ میں ہر سال آیا کرتی ہوں۔ جب آؤں بے کھٹکے جو لینا ہو مجھ سے لے لیا کیجئے۔ بھلا آپ جیسے چاہنے والے مجھے کہاں ملتے ہیں"

بی گرمی ذرا ہٹی تھیں کہ برسات خانم۔ چھم چھم کرتی آ پہنچیں۔ سانولا نمکین چہرہ چمکدار روشن آنکھیں۔ بھورے بال۔ ان میں سے پانی کی باریک باریک بوندیں اسطرح ٹپک رہی تھیں جیسے موتی۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ جسم پر بادلہ ٹکا ہوا۔ آبی رنگ کا باریک دوپٹہ۔ غرض ان کے آتے ہی ہر کھا رت چھا گئی۔ انھوں نے بڑھ کر کہا "اماں جان سلام" بڑی بی نے کہا "بیٹیا۔ جیتی رہو۔ پیٹ ٹھنڈا رہے۔ ہو۔ ہو ہو۔ تم بی گرمی کی بہن۔ برسات خانم ہو" بی برسات نے کہا "جی ہاں۔ میں پوچھنے آئی ہوں کہ میں کیسی ہوں؟" بڑی بی نے کہا "بی برسات۔ تمہارا کیا کہنا ہے۔ تم نہ ہو تو لوگ جئیں کیسے۔ مینہ چھم چھم برس رہا ہے۔ باغوں میں گھمر گھمر ہے۔ جھولے پڑے ہیں۔ عورتیں کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہے۔ سرخ سرخ جوڑے۔ دھانی چوڑیاں پہنے جھول رہی ہیں۔ کچھ جھول رہی ہیں۔ کچھ جھلا رہی ہیں۔ ملار گائے جا رہے ہیں۔ ایک طرف کڑاہی چڑھی ہے۔ دوسری طرف پوری پراٹھے پک رہے ہیں۔ مرد ہیں کہ تیراکی کا سلسلہ لگائے ہوئے

ہیں۔ لوگوں کے جمگھٹ ہیں۔ دریا چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی طرح تیر رہا ہے۔ کوئی کسی طرح اودی اودی گھٹائیں آئی ہوئی ہیں۔ پھوار پڑ رہی ہے۔ نور وز ہو رہے ہیں۔ حوضوں میں آم پڑے ہیں۔ آم کھا رہے ہیں گٹھلیاں چل رہی ہیں۔ برسات بھئی۔ برسات کا کیا کہنا سبحان اللہ"

بی برسات نے بھی ایک ہزار اشرفی کی تھیلی بڑی بی کے نذر کی اور رخصت ہوئیں۔ شام ہوتی چلی تھی۔ بڑی بی تھیلیاں سمیٹ سماٹ خوشی خوشی گھر آئیں۔ ان کی بہو نے دیکھا کہ بڑھیا بستر البغل میں دابے چلی آ رہی ہے۔ آگ بگولا ہو گئی۔ کہنے لگی "بڑھیا تو میرے گھر میں کیوں گھسی۔ کیا اپنا کفن لیکر آئی ہے۔ اب نکلتی ہے یا دھکے دے کر نکالوں" بڑھیا نے کہا "بیٹیا۔ خفا کیوں ہوتی ہے۔ میں خالی ہاتھ تھوڑی آئی ہوں۔ تین ہزار اشرفی لائی ہوں نکالتی ہے۔ نکال دے۔ میں اپنا الگ گھر لیکر رہ جاؤں گی"۔ بہو نے جو پوٹلی دیکھی اور تین ہزار اشرفی کا نام سنا۔ تو منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگی "اماں جان کیا سچ مچ تین ہزار اشرفیاں لائی ہو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ تم صبح سے کہاں چلی گئی تھیں۔ آپ کا انتظار کرتے کرتے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین بجے کھانا کھایا ہے۔ وہ بھی آپ ہی کو ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں" اتنے میں بیٹے صاحب بھی آ گئے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بیوی نے آنکھ کے اشارہ سے منع کر دیا۔ اب کیا تھا تھیلیاں کھولی گئیں۔ کئی کئی دفعہ اشرفیاں گنی گئیں۔ دو سو نکال لیں۔ باقی گرہا کھود کر دبا دیں۔ اوپر بیٹے بہو نے اپنا بستر کر دیا۔ رات ہی کو نانبائی کے ہاں سے اچھے سے اچھا کھانا۔ حلوائی کے ہاں سے اچھی سے اچھی مٹھائی آئی۔ سب نے مزے مزے سے کھائی۔ صبح ہوئی تو بیٹے صاحب جا اپنے اور بیوی کے لئے اچھے سے اچھے تھان لائے کپڑے بننے شروع ہوئے۔ بڑی بی کے پجاموں کے لئے آٹھ آنہ گز والی چھینٹ۔ انگیا کرتی کیلئے چار آنہ گز والی ململ۔ لال نری کی گول پنجے کی جوتی۔ سر میں ڈالنے کو چھوٹی تلی کا تیل۔ کانوں کے لئے ملمع کی چار چار بالیاں۔ ہاتھوں کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ ماشہ کے دو چھلے۔ غرض بہت کچھ آیا۔ بہو اور بیٹا خوش تھے کہ بڑھیا قارون کا خزانہ لے آئی۔ بڑھیا خوش تھی کہ بہو اور بیٹے نے مان تو سمجھا۔ چلو سب ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔ بی ہمسائی نے جو یہ چہل پہل دیکھی تو ان سے نہ رہا گیا۔ ایک دن پوچھا "بہن میں ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہ مانو گی" بڑھیا کی بہو نے

کہا "بہن شوق سے پوچھو - برا ماننے کی کون سی بات ہے" بی ہمسائی نے کہا "بہن - آخر ہم سے
بھی تو کہو کہ یہ تمہاری ساس کہاں سے روپیہ لے آئیں - کہیں ایسا ویسا تو نہیں ہے - بہن زمانہ
بہت برا ہے - اگر چوری کا نکلا تو بڑھیا کے ساتھ کہیں تم بھی لپیٹ میں نہ آجاؤ - حق ہمسایہ - ماں کا جایا
ہم کہے دیتے ہیں - آگے تم جانو - تمہارا کام جانے" بڑھیا کی بہو نے کہا "نا - بہن یہ بڑھیا چوری کے
قابل کہاں - اس کو تو یہ روپیہ جاڑے - گرمی - برسات نے دیا ہے" بی ہمسائی نے ناک پر
انگلی رکھ کر کہا "ای بوا - اپنے ہوش کی دوا کرو - بھلا - جاڑا - گرمی - برسات کہیں روپے
بانٹتے پھرتے ہیں - تم نے مجھے کوئی دیوانہ سمجھا ہے جو ایسی اڑان گھائیاں بتاتی ہو - بتاتی ہو
بتاؤ - نہیں بتاتی نہ بتاؤ - ہمارا سمجھانے کا کام تھا - سمجھا دیا" بڑھیا کی بہو ڈری کہ بی ہمسائی
ادھر ادھر کچھ کی کچھ نہ لگاتی پھریں - ساس پر جو گزری تھی - پوری سنا دی - بی ہمسائی
سنتی رہیں - ہنستی رہیں - سب کچھ سن سنا - کھڑکی بند کر اپنے میاں کے پاس پہنچیں اور انکو
سارا قصہ سنا دیا -

بیٹے صاحب نے جو سنا تو کہا لاؤ ہم بھی لگے ہاتھوں اپنی بڑھیا کے ذریعہ سے دو پیسے بٹوریں -
ان کی بھی ماں تھیں - وہ بڑھیا کیا تھی آفت کی پڑیا تھی - گھر بھر کا ناک میں دم کر رکھا تھا - ذرا
بگڑی اور بہو کے سات پشت کو تول ڈالا - بہو نے کچھ کہا اور قیامت آگئی - بہو کو آج موقعہ ملا -
میاں کو سمجھا بجھا کر بڑھیا کی خوب گندی کرائی - اور ڈنڈا ڈولی کر جنگل میں اسی بڑ کے نیچے ڈال
آئے - بڑھیا نے چیخ چیخ کر سارا جنگل سر پر اٹھا لیا خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ جاڑا - گرمی - برسات
تینوں اس دن پھر ملے - ایک نے دوسرے سے پوچھا - "کہو بھئی بڑھیا نے کیا تقصیر کیا"
جاڑے نے کہا "اس نے مجھے اچھا بتایا" گرمی نے کہا "مجھے اچھا بتایا" برسات نے کہا "مجھے
اچھا بتایا" جاڑے نے کہا "بھئی وہ بڑھیا آفت کی پرکالا تھی - یہ نہیں بتایا کہ تینوں میں کون اچھا ہے
سب ہی کی تعریفیں کر مفت میں تین ہزار اشرفیاں مار لیں - غرض تینوں چلے بھئے اسی بڑ کی طرف
آتے - دیکھا کہ ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی ہے - پہلے میاں جاڑے پہنچے - ان کا آنا تھا کہ بڑھیا
سردی سے تھر تھر کانپنے لگی - جاڑے نے کہا "بڑی بی سلام - مزاج تو اچھا ہے" بڑھیا بولی "چل
بڑھے پرے ہٹ - بڑی بی ہوگی تیری میّا - اب جلتا ہے یا نہیں - خود تو روئی کا بنولہ بنکر آیا ہے

اور اس جاڑے میں غریبوں کا مزاج پوچھتا ہے۔ چل سامنے سے ہٹ۔ دھوپ چھوڑ" میاں جاڑے نے کہا۔ "بڑی بی۔ میں جاڑا ہوں سچ بتانا میں کیسا ہوں" بڑی بی نے کہا "آپ اس بڑھاپے میں بھی اپنی تعریف چاہتے ہیں۔ لو۔ اپنی تعریف سنو۔ آپ آئے۔ اسکو فالج ہوا۔ اس کو لقوہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں پھٹے جا رہے ہیں۔ ناک سُڑ سُڑ بہ رہی ہے۔ دانت ہیں کہ کڑ کڑ بج رہے ہیں۔ کپڑے ادھر پھٹے۔ اُدھر میلے ہوئے۔ رضائی ہے کہ نکلتی پڑتی ہے لحاف ذرا کھلا اور سُر سے ہوا گھسی بچھونے ہیں کہ برف ہو رہے ہیں۔ کھانا ادھر اترا۔ ادھر جما اور جو خدانخواستہ کہیں مہاوٹوں میں ادبے پڑ گئے تو غضب ہی ہو گیا۔ سی سی کر رہے ہیں۔ بتیسی بج رہی ہے۔ ناک معلوم ہوتا ہے کہ منہ پر ہے ہی نہیں۔ انگلیاں ہیں کہ ٹیڑھی ہوئی جاتی ہیں۔ آنکھوں سے پانی بہا جا رہا ہے۔ نہ کام ہو سکتا ہے نہ کاج آخر کہاں تک کوئی آگ تاپے اور دھوپ سینکے۔ توبہ توبہ آگ کی بھی تو گرمی جاتی رہتی ہے۔ یہی اپنی تعریف تھی یا اور سناؤں" جاڑا جلا ہوا تو پہلے کا تھا ہی۔ اب جو بڑھیا کی یہ جلی کٹی باتیں سنیں تو اور جل کر کوئلہ ہو گیا۔ اپنی ٹھوڑی پکڑ کر داڑھی کی جو ہوا دی تو بڑھیا کو لقوہ ہو گیا۔ چلتے چلتے دو تین ٹھوکریں بھی رسید کر دیں۔ ذرا فاصلہ پر بی گرمی اور بی برسات کھڑی تھیں۔ ان سے کہا "لو جاؤ۔ بڑھیا سے اپنا تصفیہ کرا لاؤ۔ ہم تو ہار گئے"

بی گرمی خوشی خوشی بڑھیا کے پاس آئیں اور کہا "نانی اماں سلام" بڑھیا نے کہا "چل دور ہو نگوڑی۔ میں تیری نانی کیوں ہونے لگی۔ آج مجھے نانی بنایا ہے کل کسی کو خصم بنائیگی۔ آئے ہے۔ تو ایسی جوان جہان اور یوں جنگل جنگل پھر رہی ہے۔ آوارہ ہو گئی ہو گی جو ماں باپ نے گھر سے نکال دیا۔ اور نکالا بھی ایک کپڑے سے۔ اچھا ہوا۔ تم جیسے دلدروں کے ساتھ ایسی ہی کرنی چاہیے" بی گرمی نے کہا "نانی اماں۔ میں ہوں گرمی۔ تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں۔ کہ گرمی کیسی ہے" یہ سننا تھا کہ بڑھیا کے تو آگ لگ گئی۔ کہنے لگی "وہ ادہو۔ جو نبی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ۔ ابھی تمہارے بھائی صاحب اپنی تعریفیں سُن گئے ہیں۔ لو۔ تم بھی سُن جاؤ۔ گرمی۔ گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ واہ۔ واہ۔ پسینہ بہہ رہا ہے۔ کپڑوں میں سے بو آ رہی ہے۔ صبح کپڑے بدلے شام تک چکٹ ہو گئے۔ کھانا کھایا ہے کسی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ سینہ پر رکھا ہے۔ صبح ہوئی ذرا لو چلنی شروع ہوئی۔ کسی کو لو لگی۔ اسکو ہیضہ ہوا۔ منہ جھلسا جاتا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی

ہے۔ پانی پیتے پیتے جی بیزار ہوا جاتا ہے۔ پانی کیا ہے تتھڑے کا پانی ہے۔ سینہ پر اونٹ رہا ہے۔
زمین آسمان تپ رہے ہیں۔ دن بھر آگ برستی ہے رات بھر ریت برستی ہے۔ نیند غائب ہے
نہ اس کروٹ چین آتا ہے نہ اس کروٹ۔ پنکھا ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ذرا ہاتھ رکا اور دم گھٹنے
لگا۔ ذرا خدا خدا کر کے نیند آئی اور کھٹمل نے چٹکی لی۔ آنکھ کھل گئی۔ اور پھر وہی مصیبت۔ ہاں
بیگم صاحب کیوں نہ ہو۔ گرمی ہو۔ تمہاری جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ چل دور ہو میرے سامنے
سے۔ نہیں تو ایسی بے نقط سناؤنگی کہ تمام عمر یاد رکھیگی" بڑھیا کی باتیں سُنکر بی گرمی تو آگ
بگولا ہو گئیں۔ کہا "ٹھیر۔ بڑھیا۔ دیکھ تجھے اس بدزبانی کا کیسا مزا چکھاتی ہوں۔ خبر نہیں مجھ
تو کیا سمجھی ہے" یہ کہہ کر جو پھونک ماری تو ایسا معلوم ہوا کہ لو لگ گئی۔ بڑھیا تو "ہائے مری"
کہتی رہی۔ بی گرمی۔ پیٹھ پر ایک دو ہتڑ مار۔ چلتی بنیں۔

جب ان کو بھی رونکھی صورت بنائے آتے۔ بی برسات نے دیکھا۔ تو دل میں بہت
خوش ہوئیں اور سمجھیں۔ چلو۔ میں نے پالا مار لیا۔ بڑی مٹکتی مٹکاتی بڑھیا کے پاس گئیں اور
کہا "نانی جان سلام۔ کہیے مزاج تو اچھا ہے" بڑی بی نے کہا "بابا۔ مار لو۔ مار لو۔ پھر مزاج
پوچھنا۔ وہ تو اپنے دل کی بھڑاس نکال گئے۔ تم کیوں لگی لپٹی رکھتی ہو۔ بے وارث سمجھ لیا ہے
جو آتا ہے۔ مار جاتا ہے" بی برسات نے کہا "نانی جان خدا نہ کرے میں کیوں مارنے لگی۔ وہ تو دو تو
موئے ایسے ہی ہیں۔ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے بیچاری بڑی بی کا مار مار پلیتھن نکال دیا۔ نانی جان
آپ بے خوف رہیے۔ میں ایسا بدلہ لونگی کہ وہ دونوں بھی تمام عمر یاد ہی کرینگے" یہ سُنکر ذرا
بڑھیا کے حواس درست ہوئے۔ آنکھ اُٹھا کر کیا دیکھتی ہے کہ ایک جوان لڑکی نہائی دھوئی
آب رواں کا دوپٹہ اوڑھے سامنے کھڑی ہے۔ کہنے لگی۔ "لڑکی۔ کیا دیوانی ہے جو اس طرح گیلے
بالوں سے شام کے وقت جنگل میں آئی ہے۔ اور تیرا کوئی والی وارث بھی ہے یا نہیں جو اس طرح اکیلی
ماری ماری پھرتی ہے۔ جا۔ اپنے گھر جا کر بیٹھ۔ کیوں باپ دادا کا نام بدنام کرتی ہے۔ اور
ہیں۔ تو تو بالکل ننگی ہے۔ جا۔ جا۔ دور ہو۔ میں تجھ جیسی لچی لفندریوں سے بات بھی کرنا نہیں چاہتی"
بی برسات نے کہا "نانی جان خفا کیوں ہوتی ہو۔ میں برسات ہوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ
برسات کیسی" بڑھیا نے کہا "برسات خدا نخواستہ آپ بھی تعریف کے قابل ہیں۔ اے۔ ہے۔ تم

سے خدا بچائے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ کلیجہ دہلا جاتا ہے۔ دنا دھم کی آوازیں
آرہی ہیں۔ یہ مکان بیٹھا۔ وہ پاکھا گرا۔ جو مکان گرنے سے بچ گیا۔ اس میں یہاں ٹپکا لگا۔ وہاں ٹپکا لگا
کبھی ادہر کے بچھونے ادہر بچھ رہے ہیں۔ کبھی ادہر کا پلنگ ادہر آرہا ہے۔ باہر نکلنا مشکل ہے
ذرا پاؤں باہر رکھا اور چھینٹے سر سے اوپر گئے۔ سواری پاس سے نکل گئی تو سب کپڑے
چھینٹم چھینٹ ہو گئے۔ ذرا تیز چلے اور جوتیاں کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔ ہوا بند ہے۔ اُومس
ہو رہی ہے۔ کپڑے ہیں کہ چپٹے جا رہے ہیں۔ رات کو مچھر ہیں کہ کھائے جاتے ہیں۔ کھٹمل ہیں کہ
کاٹے جا رہے ہیں۔ نہ رات کو نیند نہ دن کو چین۔ اور پھر اس پر یہ سوال کہ نانی جان کیسی ہوں
نانی جان سے تعریف سن لی۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ اے۔ ہے۔ یہ لے موسم کی گرج کیسی
خدا خیر کرے۔" بڑھیا یہ کہہ ہی رہی تھی کہ بی برسات کی نگاہ بجلی بن کر گری اور بڑی بی کے پاؤں کو
چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ ادہر بی برسات بڑھیا کو لنگڑا کر منہ پر تھوک رخصت ہوئیں اور ادہر ان
کی بہو اور بیٹا اشرفیوں کی تھیلی لینے کے شوق میں بڑ کے نیچے پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بڑی بی چت
کٹی لوتھ پڑی ہیں۔ بڑی مشکل سے لاد لود کر گھر لائے خوب ہلدی چونا تھوپا۔ مرہم پٹی کی
جب کہیں جا کر دس بارہ دن میں بڑھیا اس قابل ہوئی کہ اپنی کہانی بیان کرے۔ بہو اور بیٹے نے
جو سنا کہ بڑھیا نے جاڑے۔ گرمی۔ برسات کو برا بھلا سنا کر اور اشرفیاں کھو کر جوتیاں کھائیں۔ تو
ان دونوں نے بھی اسکو خوب مارا اور گھر سے نکال دیا۔ اب بچاری سڑک کے کنارے بیٹھی بھیک
مانگا کرتی ہے۔ مگر ایسی نکچڑی کو کوئی بھیک بھی تو نہیں دیتا۔ بیٹا۔ بات یہ ہے کہ اللہ شکر خورے
کو شکر ہی دیتا ہے۔ جو لوگ خوش مزاج ہوتے ہیں وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ اور موئے
رونی صورت تو ہمیشہ جوتیاں ہی کھاتے ہیں۔ اے۔ ہے۔ ایلو۔ یہ احمد تو سو گیا۔ سعیدہ۔
ذرا اٹھا کر اسے پیشاب تو کرا لے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ موت کر میرے بچھونے خراب کر دے۔"

فرمانبردار بیٹا

سلطان اعظم پر ترک تو کیا اگر سارے مسلمان فخر کریں تو بجا و درست ہے۔ ایک بادشاہ میں

نوٹ:- یہ پورا مضمون تاریخی ہے۔ یہاں تک کہ گفتگو کے الفاظ میں بھی کوئی رد و بدل نہیں کیا گیا ہے۔

جتنی خوبیاں ہونی چاہیے وہ اسمیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ دربار میں اس کا رعب داب ایسا تھا کہ بڑی
سے بڑے سرکش آنکھ ملانے کی تاب نہ لاتے تھے۔ لڑائی میں اس کی چالیں اس بلا کی تھیں کہ دنیا
کے زبردست سے زبردست جرنیل ان کو سمجھنے سے عاجز تھے۔ خلوت میں اسکا علم ایسا تھا کہ
جید سے جید عالم اس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے گھبراتے تھے۔ رعایا اس پر ایسی دلدادہ
اور وہ رعایا کا ایسا عاشق تھا کہ ایک کو دوسرے سے اپنا حال دل کہنے میں ذرا باک نہ ہوتا تھا
اس کے دربار میں غریب سے غریب کسان اپنا حال بیان کرنے میں ذرا نہ جھجکتا تھا۔ اور وہ اس
غریب کے مقابل میں بڑے سے بڑے کو سزا دے دیتا۔ چہیتے سے چہیتے مصاحب کو سزا دینے کبھی تامل نہ کرتا
تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رعایا شاد اور ملک آباد تھا۔ قسمت اس بلا کی لیکر آیا تھا کہ جس کام میں ہاتھ
ڈالا اسکو پورا کیا۔ جس مہم کا قصد کیا اس کو سر کیا۔ اور جس سرکش کو دبایا اسکو پھر سر اٹھانے
کی ہمت نہ ہوئی۔ اگر ایک طرف سلطنت کو بڑھاتے بڑھاتے اسکی سرحد ویانا سے ملا دی۔ تو دوسری
طرف تمام بحر روم میں اپنے بیڑے کی دھاک بٹھادی۔ اگر ایک جانب بلقان کی ریاستوں میں سکہ جما دیا
کیا تو دوسری جانب تمام شمالی افریقہ میں اپنا خطبہ پڑھوا دیا۔ اس کی آواز اگر میدان جنگ میں
سپاہیوں کے دلوں کو مضبوط کرتی تھی تو اس کا قلم ملک میں امن و امان کے دریا بہاتا تھا
اس نے ان لڑائی جھگڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے انتظام کو بھی ہاتھ سے نہیں دیا۔
ملک کی مناسب تقسیم اور قوانین کی ترویج سے ترکی کو دنیا کا بہترین ملک بنا دیا۔ اس کے قوانین
ایسے تھے کہ انہیں اگر عدل و انصاف کی جان کہا جائے تو بجا ہے۔ یورپ کے بادشاہوں نے
اپنے سفیروں کے ذریعہ سے انکی نقلیں منگوائیں۔ لوگوں کو بھیج بھیج کر عدالت کے آداب و طریقے
سکھوائے۔ اور ان پر عمل پیرا ہونے کو اپنی اور اپنے ملک کی بہبودی کا باعث سمجھا۔ یورپ
کے ملکوں میں آج جو قوانین رائج ہیں۔ ان کی بنیادیں قوانین روما کے ساتھ اس بادشاہ کے اکثر
احکام پر بھی قائم ہیں۔ اگر یورپ والوں نے اس کو Magnificent (محتشم) اور اعظم
کا خطاب دیا ہے تو خود اسکے ملک والے اسکو سلیمان قانونی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

خدا نے اسکو ایک فرزند بھی ایسا عطا کیا تھا جو علم و فضل۔ تدبر و کاردانی۔ سپاہ گری
و جہانبانی میں کسی طرح باپ سے کم نہ تھا۔ مصطفےٰ بادشاہ کو چھوٹی ہی سی عمر میں ایک صوبہ کا والی مقرر

کیا گیا۔ اور اس نے تھوڑے ہی دنوں میں بتا دیا کہ سلیمان اعظم کا اگر کوئی سچا جانشین ہو سکتا ہے تو وہ ہو سکتا ہے۔ رعایا اس پر جان دیتی تھی۔ فوج اس کی عاشق تھی۔ علما ر فضلا ر اس کی قدر کرتے تھے۔ اور نافرمانوں اور سرکشوں کی روح اس کے نام سے کانپتی تھی۔ بد طینت لوگوں نے باپ بیٹے میں لڑائی ڈلوانے کی ہزار کوشش کی۔ لیکن باپ کو بیٹے پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے ہر شکایت کرنے والے کو جھڑک دیا۔ اور بیٹے کی شکایت سننے سے ہمیشہ اپنے کان بند کر لئے۔ بیٹے کو باپ پر اتنا بھروسہ تھا کہ نہ تو اس نے کبھی ان شکایتوں کے متعلق کوئی شکایت کی اور نہ شاکیوں کے خلاف اپنے باپ سے کچھ کہا۔ وہ جانتا تھا کہ میری فرمانبرداری نے جو گھر باپ کے دل میں کر لیا ہے اس میں ایسی بے سروپا شکایتیں دراندازنہیں ہو سکتیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ باپ کو میرے ساتھ جو محبت ہے وہ کسی شکایت سے نہیں مٹ سکتی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اگر باپ کے دل میں کسی دوسرے کی محبت بس گئی۔ اور دونوں محبتوں کا مقابلہ ہوا۔ تو معلوم نہیں کونسی محبت دب جائے اور کونسی غالب آجائے۔ اور اگر خود اسکا خیال باپ کے دل سے نکل جائے تو خدا جانے اس پر کیا مصیبت نازل ہو جائے۔

خدا کے کارخانوں میں بھلا کسکو دخل ہے۔ ان باپ بیٹوں کی محبت کو ایک عورت کے جال نے ایسا توڑا کہ آخر بیٹے کو خود باپ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتروا دیا۔

رزرینہ کا سلیمان اعظم کی حرم سرا میں داخل ہونا گویا ترکی سلطنت کی بنیاد دل کا ہل جانا تھا۔ یہ نہ تو کچھ بہت خوبصورت تھی اور نہ بہت تعلیم یافتہ۔ مگر اس بلا کے جوڑ توڑ کرنے والی تھی کہ اس کے تریا چلتر بڑے بڑوں کی سمجھ میں آنے مشکل تھے۔ رزرینہ کا باپ روس کا ایک غریب پادری تھا۔ خدا جانے یہ اپنے گھر سے کیونکر نکلی اور کیونکر قسطنطنیہ پہنچکر حرم سرا میں داخل ہوئی۔ قسمت نے پادری کی تھوڑے ہی دنوں میں اس کے ناز و ادا نے سلیمان کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اس نے بھی اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چھوٹتے ہی پہلے مصطفےٰ پاشاد یسعہد کی ماں پر ہاتھ مارا۔ کسی بات پر سلطانہ کو خوب کوسا کاٹا۔ بھلا ولیعہد کی ماں یہ زباں درازی کب گوارا کر سکتی تھی۔ اس نے نوکروں کو بلوا اس منہ پھٹ کو خوب پٹوایا۔ رزرینہ نے خود بھی اپنا منہ نوچ نوچ کر لہولہان کر لیا۔ جب رات کو بادشاہ نے اس کو طلب کیا تو کہلا بھیجا کہ میرا منہ

اس قابل نہیں رہا ہے کہ حضوری میں آسکوں۔ آخر بڑے کہنے سننے سے آئی۔ بہت روئی پیٹی۔ ایک ایک کی دس دس لگائیں۔ سلیمان تو اس پر جان دیتا ہی تھا۔ حکم ہوا ہے کہ سلطانہ کو محل سے نکال دو۔ وہ بچاری یہاں سے نکل بیٹے کے پاس پہنچی۔ مصطفےٰ پاشا اس وقت کرمانیا کا والی تھا۔ اس طرح ملک میں ان عورتوں نے دو محاذ جنگ قائم کر دئے۔ ایک قسطنطنیہ میں اور دوسرا کرمانیا میں۔

بایزید اول کے وقت سے سلاطین ترکی شادی نہیں کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی بایزید نے شہزادی رسپائنا سے شادی کی تھی۔ وہ لڑائی میں تیمور کے ہاتھ پڑی۔ تیمور نے اس سے لونڈیوں کی طرح کام لیا۔ اس بے عزتی کا اثر شاہان ترکی کے دلوں میں ایسا ہوا کہ انہوں نے شادی کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ مصطفےٰ پاشا کی ماں بھی حرم تھی۔ اور رزینہ بھی حرم تھی۔ اب رزینہ کو خیال آیا کہ کسی طرح خود سلطانہ بن کر سب حرموں کو محل سے نکال دے۔ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب نکالی۔ جو کچھ روپیہ پیسہ جمع کیا تھا۔ اس کو راہ خدا میں خرچ کرنا شروع کیا۔ مسجدیں بنوائیں۔ خانقاہیں بنوائیں۔ مدرسے بنوائے۔ غرض لاکھوں روپیہ ان نیک کاموں میں اُٹھا کر مفتی اعظم سے دریافت کیا کہ "ان رفاہ عام کے کاموں کا اجر مجھ کو ملے گا یا نہیں"۔ انہوں نے لکھ بھیجا کہ "خدا کی راہ میں جو کام کیا جائے۔ اس کا اجر ضرور ملتا ہے مگر چونکہ تم آزاد نہیں ہو اس لئے تمہارا مالک اس اجر کا مستحق ہے"۔ یہ فتوے ملنا تھا کہ وہ نیا رنگ لائی۔ سلیمان کے پاس رونکھی صورت بنا کر گئی۔ اس نے وجہ پوچھی تو رو رو کر بُرا حال کر لیا اور کہا کہ "دیکھئے قیامت میں مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ میں غلام ہوں۔ کوئی نیک کام بھی کرتی ہوں تو اس کا اجر مجھے نہیں ملتا"۔ بادشاہ نے اسوقت مفتی اعظم کو بلا کر مسئلہ پوچھا انہوں نے جو کچھ لکھا تھا اسکو پھر دہرایا۔ بادشاہ کو بھی رزینہ کے حال پر رحم آیا۔ اسی وقت آزادی کا پروانہ لکھ دیا۔ یہ پروانہ لے خوشی خوشی رخصت ہوئی۔ اس کے بعد جو بادشاہ نے خلوت میں طلب کیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہلا بھیجا کہ میں اب آزاد ہوں۔ غیر مرد کے سامنے بلا نکاح کے نہیں آسکتی۔ کچھ دنوں سلیمان نے اپنی طبیعت کو روکا آخر محبت غالب آئی اور رزینہ سے نکاح کر کے اسکو ملکہ بنانا پڑا۔ نکاح کے بعد خرم سلطانہ کا خطاب ملا۔ اور سارے محل میں اس کا عمل دخل ہو گیا۔

رزینہ کے بطن سے سلطان سلیمان کے چار لڑکے محمد۔ جہانگیر۔ بایزید۔ اور سلیم اور ایک

مہرماہ ہوئی۔ محمد تو کم عمری ہی میں مرگیا۔ جہانگیر اپاہج اور مصطفٰے پاشا جان دیتا تھا۔ اس لیے کام کا نہ تھا۔ بایزید پر اس کو بھروسہ نہ تھا۔ اس وجہ سے رزینہ نے چاہا کہ کسیطرح سلیم کو ولیعہد بنادے سب سے پہلا کام تو اس نے یہ کیا کہ سلیم کو صوبہ سروخاں کی گورنری سے بدل کر قونیہ کی گورنری پر بلوالیا۔ تاکہ قریب ہونیکی وجہ سے ضرورت کے وقت فوراً قسطنطنیہ آسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ بادشاہ کے چاہتے وزیر ابراہیم پاشا کے خلاف سازشیں شروع کیں تاکہ اپنے داماد رستم پاشا کو وزارت پر جمائے۔ ابراہیم اور سلیمان میں ایسی دوستی تھی کہ شاید ہی کسی وزیر اور بادشاہ میں کبھی ہوئی ہو۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ ابراہیم پاشا کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ تاریخ میں ایسے بہت کم وزیر ملینگے جو بند و بست ملک اور انتظام میدان جنگ دونوں پر اس کا مقابلہ کرسکیں۔

سلیمان نے ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں تجھ کو کوئی گزند نہ پہنچیگا۔ ابراہیم کو اس وعدہ پر اعتبار تھا۔ اس لئے اکثر اپنی مرضی سے وہ کام کر بیٹھتا تھا جو اس کے اختیارات کے باہر ہوتے تھے۔ لیکن سلیمان ہمیشہ طرح دے جاتا۔ اور کہتا کہ کیا کروں تجھ سے وعدہ کیا ہے لاچار ہوں نباہوں گا۔" رزینہ کو بھی اس وعدہ کی خبر تھی۔ سوچتے سوچتے ایک پہلو نکالا کہ بادشاہ نے زندہ رہنے تک ابراہیم کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے سوتا اور مردہ دونوں برابر ہے۔ اگر بادشاہ کے سوتے وقت ابراہیم کو قتل کردیا جائے تو اس وعدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسی زمانہ میں ابراہیم پاشا نے ایک دوسرے جرنیل کو جو اس کے ساتھ ایران پر فوج کشی کے لئے بھیجا گیا تھا قتل کردیا بادشاہ کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ رزینہ سے شکایت کی اور ساتھ ہی اپنے وعدہ کا بھی ذکر کیا رزینہ نے کہا "یہ کیا مشکل ہے۔ آپ سو جائے میں ابراہیم کو ٹھکانے لگا دیتی ہوں" معلوم نہیں کہ سلیمان اس پر راضی ہوا یا نہیں۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ اسی رات کو ابراہیم پاشا قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے اعجاز پاشا اور سلیمان پاشا وزیر ہوئے لیکن سال بھر کے اندر ہی اندر خرم سلطانہ نے اپنے داماد رستم پاشا کو وزارت کی کرسی پر لا بٹھایا۔ رستم پاشا نے وزارت ملتے ہی مصطفٰے پاشا کو چھیڑنا شروع کیا۔ بڑے سخت سخت احکام جاری کئے۔ تنخواہ کم کردی۔ مراسلات میں سے القاب و آداب حذف کئے۔ مگر مصطفٰے پاشا نے ان چیزوں کا خیال تک نہ کیا۔ اور اسکی فرمانبرداری میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ جب اس طرح کام نہ چلا تو بادشاہ

کی جانب سے زہر آلود خلعت بھیجا گیا۔ مصطفےٰ پاشا کی ماں اپنی سوکن کو خوب سمجھتی تھی۔ اس نے پہلے لانے والے ہی کو یہ خلعت پہنوایا۔ اور اسطرح ایک ناکردہ گناہ رزینہ کی چالوں کا شکار ہو گیا جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو کھلم کھلا مخالفت شروع کی۔ قسمت نے یاوری کی تھوڑے ہی دنوں میں اس کو ایک موقعہ بھی مل گیا۔ شاہ طہماسپ صفوی ایران کے بادشاہ کا بھائی الیاس مرزا قسطنطنیہ پہنچا اور اپنے بھائی کے خلاف سلطان سلیمان سے مدد چاہی۔ رزینہ تو ایسے موقعہ کی تاک ہی میں تھی۔ کہہ سن کر بادشاہ کو فوج کشی پر راضی کر لیا۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک یہ کہ بادشاہ کی عدم موجودگی میں شہزادہ سلیم کو حکومت کرنے کا موقعہ ملے۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ کو مصطفےٰ کے خلاف بھڑکانے کی شکل نکلے۔ ابھی قسطنطنیہ میں لشکر جمع ہو رہا تھا کہ مصطفےٰ پاشا کا ایک افسر گرفتار ہو کر دربار میں لایا گیا۔ اور اس کے پاس سے شاہ طہماسپ کے نام مصطفےٰ کا ایک خط نکلا جسمیں لکھا تھا کہ "اپنی لڑکی سے میری شادی کر دیجئے تو میں سلطان کو قتل کر کے لڑائی کی مصیبت سے آپ کو بچائے لیتا ہوں۔" یہ نمک حرام افسران سازش کرنے والوں سے ملا ہوا تھا۔ اور جان بوجھ کر اس جعلی خط کے ساتھ گرفتار ہوا تھا۔ اب کیا تھا ادہر رزینہ نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ ادہر رستم پاشا نے مصطفےٰ کی شکایتوں کا طومار باندھا۔ جھوٹی شہادتیں پیش ہوئیں کہ مصطفےٰ پاشا کرمانیا میں حملہ کی تیاری کر رہا ہے۔ آخر کسی نہ کسی طرح مصطفےٰ پر لشکر کشی کی اجازت حاصل کر ہی لی۔ رستم پاشا بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ کرمانیا کی طرف روانہ ہوا۔ مصطفےٰ پاشا نے باپ سے اس حملہ کی وجہ دریافت کی تو اس کا جواب تک نہیں دیا گیا۔ آخر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اور رستم نے شکست کھائی۔ جب بادشاہ نے باز پرس کی تو رستم نے اس شکست کا باعث مصطفےٰ کی ہردلعزیزی کو بتایا اور کہا کہ ولیعہد کے مقابلہ میں کوئی فوج مقابلہ کو تیار نہیں ہے۔ رزینہ نے داماد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن سلیمان کو کسی طرح یقین نہ آیا۔ آخر صلاح یہ ہوئی کہ ایران پر فوج کشی کے بہانہ سے کرمانیا کے پاس سے گزرا جائے اور مصطفےٰ کو طلب کیا جائے اگر وہ آنے سے انکار کرے تو فوج کا رخ بجائے ایران کے اسکی طرف پھیر دیا جائے۔ ہاں اگر وہ آجائے تو ایسی صورت میں واقعات کی دریافت کیجائے۔

قصہ مختصر لشکر روانہ ہوا اور سلطان کے ساتھ رزینہ۔ رستم پاشا۔ جہانگیر اور سلیم بھی چلے

شام سے گزر کر جب ارغلی پہنچے تو مصطفے پاشا کے نام حکم جاری ہوا کہ فوراً حاضر دربار ہو۔ ادہر یہ حکم جاری ہوا۔ ادر ادہر احمد پاشا وزیر خارجہ نے مصطفے کو لکھا کہ "اگر جان عزیز ہے تو ادہر آنے کا ہرگز قصد نہ کرنا"۔ یہ دونوں خط ساتھ ہی ساتھ پہنچے۔ مصطفے پاشا پریشان تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے آخر مفتی کو بلایا۔ اور پوچھا کہ "عزت کی موت بغاوت کے شبہ سے بہتر ہے یا نہیں"۔ انہوں نے جواب دیا کہ "شرافت کی زندگی تمام دنیا کی بادشاہت سے بہتر ہے"۔ یہ جواب سنکر مصطفے پاشا نے دل میں ٹھان لی کہ جو کچھ ہو سو ہو میں جاؤنگا اور ضرور جاؤنگا۔ چنانچہ اسی وقت تھوڑے سے سوار لے کر دربار کا رخ کیا۔ زرینہ اور رستم سمجھے تھے کہ مصطفے بڑی بھاری فوج کے ساتھ آئیگا اور اس طرح باپ کو بیٹے کے خلاف بھڑکانے کا موقع ملے گا۔ لیکن مصطفے کے اس طرح یکہ و تنہا آنے نے انکی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اب صرف ایک چال رہ گئی تھی کہ مصطفے پاشا کا پرجوش خیر مقدم کرنے کے لئے فوج کو ابھارا جائے تاکہ سلطان کو یہ یقین ہوجائے کہ فوج ولیعہد کے ساتھ ہے۔ فوج تو مصطفے پاشا پر جان دیتی ہی تھی۔ جب زرینہ اور رستم دونوں نے اس کو اظہار جذبہ پر ابھارا تو انہوں نے شاہزادہ کے آنے پر ایسا اظہار مسرت کیا کہ کبھی اپنے بادشاہ کے لئے بھی نہیں کیا تھا۔ مصطفے پاشا اس چال کو سمجھ گیا۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ یہ جوش کم ہو لیکن ایک طرف تو فوج کے حقیقی جوش عقیدت اور دوسری طرف ان لگانے والوں کی ترکیبوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور وہ سمجھ گیا کہ اب اس جال سے نکلنا مشکل ہے۔ اس نے بہت چاہا کہ فوراً باپ سے مل کر اپنی صفائی پیش کرے۔ لیکن زرینہ نے پورے ایک دن بادشاہ کو محل سرا سے باہر نہ آنے دیا اور اس عرصہ میں وہ لگائی بجھائی کی کہ سلیمان کو حکم دینا پڑا کہ اگر کل تک فوج کا جوش کم نہ ہو تو مصطفے پاشا کا خاتمہ کر دیا جائے۔ دوسرے دن شاہی خیمہ میں شاہزادہ کی طلبی ہوئی۔ اس کے ہواخواہوں نے اس کو جانے سے بہت روکنا چاہا۔ مگر وہ کسیطرح راضی نہ ہوا اور کہا کہ "مجھے اپنی جان جانے کا ذرا افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ وہی شخص میری جان لے رہا ہے جس نے مجھے یہ جان دی تھی"۔ بہرحال اپنے ساتھیوں سے رخصت ہوا۔ اپنی بیگناہی کے ثبوت میں سفید لباس پہنا۔ واقعات کے متعلق ایک تفصیلی خط باپ کے نام لکھ جیب میں ڈالا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو دربار کا راستہ لیا۔

رستم پاشا نے سوچ سمجھ کر راستہ میں دو رویہ فوج کا پرا قائم کر دیا تھا۔ فوج نے جو شاہزادہ کو آتے دیکھا تو اس زور سے "مصطفےٰ پاشا جوق لیشا" کے نعرے مارے کہ زمین و آسمان ہل گئے۔ زرینہ اور رستم دونوں پہلے سے بادشاہ کے خیمہ میں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے جال کی ڈوریاں کسنی شروع کیں۔ سلیمان کو بھی یقین ہو گیا کہ مصطفےٰ اگر چاہے تو ابھی مجھکو تخت سے اُتار کر خود بادشاہ بن سکتا تھا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے سلطانہ کو مصطفےٰ کے معاملہ میں مختار کل کر دیا۔ یہ اجازت ملنی تھی کہ زرینہ بادشاہ کو بازو کے خیمہ میں لیگئی اور دربار کا خیمہ بالکل خالی کر دیا گیا۔

مصطفےٰ پاشا لشکر میں سے گذر شاہی خیمہ کے دروازہ پر آیا۔ یہاں اس نے اپنے ان دو چار ساتھیوں کو بھی رخصت کیا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ کمر سے اپنا خنجر کھول کر دربان کے ہاتھ میں دیا۔ اس نے لینے میں تامل کیا تو شاہزادہ نے کہا "عزیز من۔ میں اپنے ساتھ اپنی بے گناہی کے سوا اور کوئی چیز باپ کے حضور میں لیجانا نہیں چاہتا۔ کیا خبر ہے کہ واقعات ایسے پیش آئیں جو بلا سوچے سمجھے مرا ہاتھ خنجر پر جا پڑے اور ہمیشہ کے لئے میری اطاعت و فرمانبرداری پر حرف آئے۔" یہ کہہ اور خنجر رکھ اس نے خیمہ کا پردہ اُٹھایا کیا دیکھتا ہے کہ سارے خیمہ میں اندھیرا اور سناٹا ہے۔ نہ آدم ہے نہ آدم زاد۔ لیکن چاروں طرف پردوں کی شکنیں چھپے ہوئے قاتلوں کا پتہ دے رہی ہیں۔ اس بدلے ہوئے رنگ کو دیکھکر بھی وہ ذرا مایوس نہ ہوا۔ اسی طرح آہستہ آہستہ چلکر خالی تخت کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ پہلو کے پردوں میں سے سات حبشیوں کے چودہ ہاتھ اس کی گردن کیطرف بڑھے۔ یہ دیکھ کر اس کو جوش آگیا۔ لیکن پھر سنبھلا اور کہا "ٹھیر دیں پہلے یہ پوچھ لوں کہ والد کی مرضی سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے یا اس میں کسی اور کا اشارہ ہے۔" اس کا جواب ایک پردہ کے پیچھے سے ملا کہ "یہ میرا حکم ہے۔" یہ سننا تھا کہ مصطفےٰ پاشا نے گردن جھکا لی۔ باہر فوج "مصطفےٰ پاشا جوق لیشا" کے نعرے مار رہی تھی اور اندر سات حبشی اس فرمانبردار بیٹے کی گردن دبا کر ہمیشہ کے لئے اس کو خاموش کر رہے تھے۔ باپ کا حکم سننے کے بعد اس ناکردہ گناہ نے اپنے بچانے کی ذرا کوشش نہ کی۔ اور تھوڑی دیر میں اس کی لاش اس تخت پر لٹا دی گئی جس پر اسے ایک دن

بیٹھتا تھا۔ یہ عشی اپنے کام سے فارغ ہوکر پردوں کی آڑ میں ہوئے ہی تھے کہ۔ شاہزادہ جہانگیر خیمہ کے اندر آیا۔ اس کو مصطفےٰ پاشا سے عشق تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بھائی کی نعش تخت پر پڑی ہے دیوانہ وار نعش سے لپٹ گیا۔ اور وہیں بھائی کی پیشانی کو بوسہ دیتے دیتے خود اپنی جان دیدی یہ دونوں مر گئے۔ لیکن ایک دنیا کو یہ سبق دے گیا کہ فرمانبردار بیٹے ایسے ہوتے ہیں۔ اور دوسرا بتا گیا کہ سوتیلے بھائیوں میں بھی ایسی محبت ہوسکتی ہے۔ جو سگے بھائیوں میں بھی ہونا مشکل ہے۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو　　ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ایک وصیّت کی تعمیل

خدا بخشے۔ مولوی وحیدالدین "سلیم" بھی ایک عجب چیز تھے۔ ایک نگینہ سمجھئے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا۔ جب تراشا گیا۔ پہل نکلے۔ چمک بڑھی اہلِ نظر میں قدر ہوئی۔ اُس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا شہرت بھی "غالب" کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی۔ اِدھر نام بڑھا اور اُدھر مرا۔ صف سے آگے نکلا اور تیر قضا کا نشانہ ہوا۔ چل چلاؤ کا زور ہے۔ آج یہ گیا کل وہ گیا مولوی نذیر احمد گئے، شبلی گئے، حالی گئے، وحیدالدین گئے۔ اب بڑوں میں مولوی عبدالحق رہ گئے ہیں۔ ان کو بھی شہرت کی رَیہ لگ گئی ہے۔ سوکھے چلے جارہے ہیں۔ کسی دن یہ بھی خشک ہوکر رہ جائینگے۔ یہ تو جو کچھ تھا سو تھا، ایک نئی بات یہ ہے کہ آج کل کا مرنا بھی کچھ عجب مرنا ہوگیا ہے پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے، بتی جلتی، تیل خرچ ہوتا، تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا ٹمٹماتا، لو ٹھٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہوجاتا۔ اب چراغ کی جگہ زندگی بجلی کا لیمپ ہوگئی ہے۔ اِدھر بٹن دبا اُدھر اندھیرا گھپ۔ عظمت اللہ خاں، اسی طرح مرے، مولوی وحیدالدین اسی طرح رخصت ہوئے، اب دیکھیں کس کی باری ہے۔ اردو کی مجلس میں دو چار لیمپ جل رہے ہیں۔ وہ بھی کسی وقت کھٹ سے گل ہوجائینگے، اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے۔

میں مدت سے حیدرآباد میں ہوں۔ مولوی وحیدالدین بھی برسوں سے یہاں تھے، لیکن کبھی

ملنا نہیں ہوا۔ انہیں ملنے سے فرصت نہ تھی، مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسہ میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لئے جو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں ماسٹر بھی ہیں کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں، کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں۔ کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل الہی اور نگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے غپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف چلے آ رہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، ناڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پاجامہ کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتہ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ حیران تھا کہ یا الہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا اسین ہونے والا ہے۔ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چپ ہو گئیں، اس وقت انہوں نے فرمایا "میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمہارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آ کر ملوں مگر موقعہ نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد بھی اُن کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا" میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں، بسم اللہ کیجئے مر جائیے، مضمون میں لکھ دوں گا"۔ کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے معذرت کی، وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے

لپٹتے رہے۔ سر ہو گئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انہوں نے ان کا سامان لا میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی اور ادھر ان کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں درجۂ اول میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب، میں، اور رفیق بیگ۔ رفیق تو سو گئے، ہم دونوں نے باتوں میں صبح کر دی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحات زبان اردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں۔ مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کر دی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے۔ پھبتیاں اڑیں، اس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی۔ ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو تو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑہ رہا۔

میں شاعر نہیں ہوں، ہاں بعض دفعہ دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں مجھے بڑا تعجب ہوا، جب مولوی صاحب نے کہا، "فرحت تو شاعر ہے، کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے، ہو سکے تو کچھ کہہ لیا کر۔" میرے ایک قطعہ تاریخ سے ایسے خوش ہوئے کہ اسی وقت اٹھ، قلم دوات نکال وہ قطعہ لکھ لیا۔ آپ بھی سن لیجیے، کہتے ہیں کہ نئی طرز کی تاریخ ہے، ہو گی۔ ہم کو تو نہ اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنی پڑی اور نہ اس کی کوئی قدر ہے، ہاں قطعہ سے پہلے اس کی شان نزول سن لیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر لگاتے تھے، پیسہ پاس نہیں تھا، مگر چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں پھریں اور وہ بھی اس طرح نہیں جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں، بلکہ اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پھرتے تھے ادھر کوشش کی ادھر کوشش کی، آخر سرکار سے منظوری ہو ہی گئی۔ ڈھائی تین برس میں سارا یورپ چھان مارا۔ شمالی افریقہ کے سب ملک دیکھ لیے۔ عراق، عرب، شام، ترکی غرض سینکڑوں ملکوں کی

سیر کی۔ آئے اور بڑی دھوم دھام سے آئے۔ وہ نام پیدا کیا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ دوستوں نے مجھ سے تاریخ لکھنے کا تقاضہ کیا مار مار کر شاعر بنایا۔ تاریخ ہوئی ہے :-

پھر پھرا کر مرے اک دوست سفر سے آئے / بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر
دوستوں کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو / میں بھی شاعر ہوا اللہ کی قدرت ہی تو ہے
میرے انکار سے احباب نہ رنجیدہ ہوں / اس لئے لکھتا ہوں تاریخ بہت ڈر ڈر کر
ایک طائر کو قفس میں تھا خیالِ گلشن / پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا جھکائے ہوئے سر
رحم کچھ آگیا صیّاد کے دل میں شاید / ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھولکے در
در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا / پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر
خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے لیئے / خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکر
بچتا وہ گردشِ افلاک سے آخر کب تک / ہوتا کب تک نہ زمانے کے تغیر کا اثر
آب و دانہ اُسے پھر کھینچ کے لایا سوئے دام / باندھے صیّاد نے پھر طائرِ آزاد کے پر
لکھی "فرحت" نے یہ کس زور کی فصلی تاریخ / پھر وہی کنجِ قفس[1] پھر وہی صیّاد کا گھر

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے۔ لیکن آخر میں بالکل کھل گئے۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے وہ سن لیجئے سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اُن میں ظرافت کا مادّہ بہت تھا۔ لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کرلیتی تھی کسی کو بُرا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی۔ اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ اِدھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا جو سچے دل سے اُن کو چاہتا ہو۔ اِن کے علم، اِن کی سمجھ، ان کی زود فہمی اور اِن کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں لیکن اِن کی طبیعت کے سب شاکی ہیں۔ اور وہ خود بھی اس سے بیزار، مجھ سے بیزار، تم سے بیزار، غرض اپنے سوا ساری دنیا سے بیزار تھے۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے زمانے کی وہ وہ ٹھوکریں اُٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصائب کا

[1] "پھر" کی جگہ "اگر" اور "ر" رکھا جائے تو مادۂ تاریخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے ہیں تو ان کے آگ لگ جاتی۔ ایک دن
میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا۔ انہوں نے ہر دفعہ یہی کہا "ارے میاں گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں
لکھتا۔ اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گذار دی۔ اس اخبار کی
اڈیٹری کی، اس رسالہ کے منیجر ہوئے، سرسید کی خدمت میں سر گاڑی پاؤں پہیہ کیا، اب جو چند روپے
مل رہے ہیں تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، اخیر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے۔" میں نے کہا
"مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤگے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہل کمال ہمیشہ
آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے بہت ہے "نہ آگے
ناتھ نہ پیچھے پگا" مزے کیجئے بہت گئی ہے تھوڑی رہی ہے۔ ہنسی خوشی یہ بھی گذار دیجئے۔" وہ بھلا میری
باتوں کو کیا سننے والے تھے۔ اُن کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اُٹھائی تھی، نااہلوں کو
آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دیا نہیں آتا تھا
بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ
وسیع ہوئی، اتنا ان کا دل تنگ ہوا، جتنی اُنکے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اتنی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں
ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا، جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب، آپ کی کفایت شعاری نے
بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے تو اب لکھتے کیوں ڈروں، واقعی بڑے ہی کنجوس تھے
تھے۔ ہزار روپے کے گرہ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ ملجاتا تھا، مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی
زیادہ ہوگا۔ اس کی صراحت میں آگے چل کر کروں گا ہاں ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے
پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر
کب تک ہیں اور کب نکال دیئے جائینگے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے
کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے جمع پونجی دوسروں کے لئے چھوڑ گئے۔ اور چھوڑ بھی اتنا گئے کہ بعض لوگوں
کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہرحال یونہی ہنستے بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا موٹروں
میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا تنا ہے۔

منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا اُس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی۔ راستہ کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہوگئی۔ بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ تیسرے وقت بڑے کہنے سُننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔ دوسرے روز ان کا لکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی۔ پھر بھی بڑے میاں کو جوش آگیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا، ریشمی شیروانی نکالی، نئی ترکی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک دیا، پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ۔ کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ تھا۔ اسٹیج پر کرسی بچھادی گئی۔ انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا۔ میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہوجاتا ہے، مگر مولوی صاحب کے طرز ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا، مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے، یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کر رہی ہے۔ برس روز ہو چکا ہے مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لکچر انہی سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خداداد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا غرض کچھ بھی ہو اس میدان میں ان کا مدمقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اُس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ "سنہ ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام ہی کے لئے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں۔ آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھائے

گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، شمعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی۔ اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کرکے اس بے چینی کو کم کردوں، میں نے کہا "یارو! ذرا جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔ مزا کرا ہو جائے گا۔ میں باہر جاکر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں۔ تمہارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا۔ میں اپنی اسپیچ ختم کر دوں گا۔" اتنا کہہ میں چٹ باہر پردے کے سامنے آگیا۔ مضمون سوچنے کا موقعہ نہیں ملا تھا، اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کردوں۔ جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف "طبقات شعراء ہند" سے منسوب کرکے یہ ظاہر کیا ہے یہ مشاعرہ انہی کے مکان پر نواب زین العابدین خاں کی مدد سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ابتداً اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرایہ میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلودہ کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر ان کے دہلی میں آکر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کرکے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعراء اس میں جمع ہوئے۔ میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحیدالدین وسلیم کی طرف ہو گیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کر لیے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحیدالدین کے والد تھے۔ ناموں کے ایکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی۔ اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹتے رہے۔ خدا خدا کرکے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے "فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ بڑی

غسل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا، پان بنا کر دیا، سگریٹ پیش کیا، جب جا کر ذرا نرم پڑے۔ اور واقعہ بیان کیا۔ میں نے کہا "مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقعہ ہی کیا تھا۔ دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے، کہاں کے تھے، دھلی آئے بھی تھے یا نہیں، کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے۔" کہنے لگے "تو گھڑی گھڑی ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا۔" میں نے کہا "مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کر لیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے، ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے۔ کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے "جی ہاں میرے والد تھے۔ کچھ آپ کا دینا آتا ہے؟"

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا۔ جب کچھ لکھتا پہلے ان کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے، ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال نہ بچہ نہ نوکر نہ ماما۔ میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، آواز آئی "کون؟" میں نے کہا "فرحت" اسی وقت کرتہ پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے، اس پر میلی چاندنی ہے، دو چار چیکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیوار پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ گندا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں۔ ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے گھٹلنگ جوتیوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجئے، مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں، سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ، گرم ہو رہا ہے، چائے بن رہی ہے۔ خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے۔

چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال دو ایک چکر دے نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے، کبھی میں گیا دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں۔ کہنے لگے "نہیں بھئی، میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ صرف چائے پر گزران ہے۔" تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیونکر کھاتے۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی، سامان منگوانا ہوتا، لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ۔ غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنائی پی لی۔ اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا، گھر آئے، بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری۔ چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔ ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر آسا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضہ میں ہے۔ کسی کے پاس ہو، سونے میں تو بڑا آرام دیگی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار دوست شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ صاف کر جمع کرتے جاتے۔ انہی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے۔ غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انہیں کاغذوں پر ہوتا۔ خدا معلوم ایسے جھرجھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیونکر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر انہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوجداری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے لفظ دماغ سے اُتارتے کہ بایدو شاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انہوں نے شعر پڑھا۔ پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اُس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لئے کون دیوان ڈھونڈتا بیٹھے۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کھدیا گیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے۔ مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہ نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، اِن ٹکڑوں کی اصل کیا ہے، اور اس اصل کے کیا معنی ہیں، اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہوگیا۔ الفاظ کے ساتھ انہوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، انہیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحید الدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور اب اِن کے بعد اِن کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی۔ مگر وہ اُردو کے لئے بنے تھے، اور اُردو ان کے لئے۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہل قلم کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتے مولوی صاحب کیا مرے، زبان اُردو کا ایک ستون گر گیا۔ اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بنا تو کجا، اس حصے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ اِن کی جگہ بھرنے کے لئے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے، مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد لکھ رکھیں کہ چاہے اس سرے سے اُس سرے تک ہندوستان چھان ماریں، مولوی وحید الدین سلیم، جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے ان کا پاسنگ بھی ملجائے تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

بہ کر کہیں سے کہیں نکل گئے ہیں۔ اور بعض جگہ انہوں نے کسی واقعے کو چمکانے کے لئے گرد و پیش کے
دوسرے واقعات کو مدھم کر دیا ہے، آزاد مرحوم اُستاد ذوق کے عاشق تھے اور کیوں نہ ہوتے
وہ اُن کے اُستاد تھے، بادشاہ کے اُستاد تھے، قلعہ بھر کے اُستاد تھے، ایسے اُستاد کی جتنی بھی تعریف
کیجائے وہ تھوڑی ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس زمانے میں ساری دلی اُستادوں سے بھری پڑی
تھی۔ اُستاد ذوق کو آسمان پر پہنچانا آسان نہ تھا۔ آبِ حیات کی قدر بڑھانے کے لئے ظلمات
پیدا کرنا اور آئینے کو چمکانے کے لئے چوکھٹے کی چمک کو مارنا پڑا۔ اس گھسنے گھسانے میں چوکھٹے کا ایک
کونہ ہی توڑ بیٹھے۔ دنیا بھر نے غل مچایا کہ حضرت! بچارے حکیم مومن خاں مومن نے کیا قصور کیا تھا،
کہ وہ اس مرقع میں نظر نہیں آتے۔ آپ نے جھٹ اِدھر اُدھر سے ٹکڑا ڈھونڈھ گوند سے چپکا دیا
آزاد نے نواب الٰہی بخش خاں معروف، کے دونوں دیوان اُستاد ذوق سے منسوب کر دئے
ہیں۔ اس کے متعلق نواب احمد سعید خاں طالب، دھلوی نے اُن سے پوچھا کہ اُستاد جب معروف،
کا پہلا دیوان مرتب ہوا ہے، اس وقت ذوق کی عمر (۶) سال کی تھی۔ ذرا یہ تو بتا دیجئے کہ کیا پیدا
ہونے سے پہلے انہوں نے اس دیوان کو لکھنا یا کم سے کم اصلاح دینی شروع کر دی تھی، اس کا
جواب ملا کہ ہاں غلطی ہو گئی۔ آئندہ اڈیشن میں درستی کر دونگا۔ اس کے بعد خود دیوانے ہو گئے،
چلو چھٹی ہوئی، معروف کے دونوں دیوان بھی اُستاد کے قبضے میں آگئے۔ اب رہے بچارے
بادشاہ سلامت۔ وہ تو شاگرد ہی تھے، اُن کے متعلق تو جو کچھ کہو سچ اور درست ہے۔ اس کی
تردید کون کرے گا ایک شاگرد نے دوسرے شاگرد کی تمام عمر کی کمائی اُستاد کو دے دی۔ اچھا
کیا اُستاد باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ شاگرد کا مال اُستاد کا اور اُستاد کا مال تو اُستاد کا ہے ہی۔ میری
تو یہ رائے کہ بادشاہ یا امیر کبھی شاعری کریں تو خدا کے لئے کسی کے شاگرد نہ ہوں۔ دنیا کو یہ غلط فہمی
ہو گئی ہے کہ بادشاہ اور امیروں میں شعر گوئی کا مادہ نہیں ہوتا۔ اور وہ کچھ لکھ ہی نہیں سکتے۔ سب
لکھا پڑھا اُستاد ہی کا ہوتا ہے۔ ظفر کے جیتے جی ذرا دبی دبی آواز میں پھلو بچا کر حکیم آغا جان عیش نے
بھی اس کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

شاگرد و اُستاد میں ہوتا ہے فرق پر   طرزِ سخن میں ذوق و ظفر دونوں ایک سے ہیں

غدر ہوا، ظفر قید ہوئے، جلاوطن ہوئے، مر گئے۔ آزاد مرحوم نے ان کے چار دیوان اُٹھا اُستاد

ذوق کے بستے میں باندھ دیئے اب خدا را کوئی انصاف کرے کہ کیا "طرزِ سخن میں ذوق و ظفر دونوں ایک ہیں" کیا ذوق کے دیوان بھر میں ایک غزل بھی ظفر کے طرز کی نکل سکتی ہے۔ کیا ظفر کے چاروں دیوانوں میں کوئی غزل بھی ایسی ہے جو ذوق کی غزل کہی جاسکے۔ اگر نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہوے کہ ذوق کے دو علیحدہ علیحدہ رنگ تھے۔ اور اگر معروف کے کلام کو بھی شریک کرلو تو گویا تین رنگ تھے اور اُستاد ذوق ان تینوں رنگوں میں ایسے مشاق تھے کہ ایک رنگ کی جھلک تک دوسرے رنگ میں آنے نہیں دیتے تھے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ اصلاح سے اُستاد کا کچھ رنگ شاگرد کے کلام میں پیدا ہو جاتا ہے۔ انشاء اللہ خاں جس کے اُستاد ہوے اس کے ہاں چھُل پیدا کر دی۔ میر صاحب کے جو شاگرد ہوے۔ اُن کے ہاں وہی "ہائے ہائے" کا رنگ آگیا پھر آخر یہ کیا بات ہے کہ معروف کا رنگ ظفر کے رنگ سے اور ان دونوں کا رنگ اُستاد ذوق سے بالکل جدا ہے۔ درحالیکہ کہا جاتا ہے کہ دو دیوان معروف کے اور چار دیوان ظفر کے، چھوں کے چھوں بسم اللہ سے لگا کر تمت تک اُستاد ذوق کے لکھے ہوتے ہیں۔ ذوق کی وفات کے بعد کا جو کلام ظفر کا ہے، اس کے متعلق جواب وہی کرنی خود آزاد مرحوم کو بھی دشوار ہو جاتی وہ تو خدا بھلا کرے مولانا حالی کا انہوں نے اس بچے بچائے حصہ کو اپنے اُستاد کے لئے سمیٹ کر اس مشکل کو حل کر دیا۔ شاید مولانا حالی سے بھی دریافت کیا جاتا تو وہ نہ بتا سکتے کہ ظفر کی وہ کون کون سی غزلیں تھیں جن کا صرف ایک مصرعہ لکھ کر آیا تھا اور اُن کی تکمیل غالب نے کی تھی۔ غالب مرحوم کی اصلاح سے تو ان کے شاگردوں کی غزلیں اس طرح کی ہو جاتی تھیں۔

میں نے کہا کہ دعوے الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

بھلا کہیں غالب کی لکھی ہوئی یہ غزل ہو سکتی ہے۔

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا
مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ کہنا اس سے کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشق زار تھا تہ خاک اُس کو دبا دیا

بات دراصل یہ ہے کہ ظفر کا نام دنیا سے مٹانا چاہتے تھے۔ سلطنت جا چکی تھی پھر بھی خاندان مغلیہ کی پرانی محبت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھی۔ ظفر کا کلام دیکھنے سے دلوں میں جوش آتا تھا کہ ہمارا بادشاہ اگر زمین کا بادشاہ نہ تھا تو کم سے کم زبان کا تو بادشاہ تھا۔ اس نقش کو مٹانا مقصود تھا۔ آزاد مرحوم کے زورِ قلم نے اس منشار کو بھی پورا کر دیا۔ ظفر رنگوں میں مر گئے اور ان کا کلام ان دونوں بزرگوں کے ہاتھوں مر نہیں گیا تو کم از کم دوسروں کا ضرور ہو گیا۔

بہر حال آزاد مرحوم نے اپنے اُستاد کو خلعت دوام دینے کے لئے بہتوں کے خلعت یا تو اُتار لئے یا پھاڑ چیر کر گدڑی کر دئے۔ اور اس غرض کو حاصل کرنے میں کچھ خود محنت کی کچھ دوسروں کے سر ڈال دی، ان کی ذاتی عنایت کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ دوسروں کی کارگذاری دیکھنا ہو تو آب حیات میں حکیم آغا جان عیش اور ہد ہد کے واقعات دیکھ لو وہ جانتے تھے اگر ہد ہد کو غالب اور مومن جیسے لوگوں سے مشاعرے میں لڑا دونگا تو دنیا بھر میں کوئی بھی میری بات ماننے والا نہیں اس لئے انھوں نے یہ کیا کہ ہد ہد کو حکیم آغا جان عیش کا بِجھو بنا کر میدان میں اتارا۔ جو جانور ہد ہد کے مقابلے میں آیا اس کو کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اور اس پالی کی ہار جیت سے کچھ نہیں کیا تو کم سے کم ذوق کے برابر والوں کا مذاق اُڑا کر ان کی شان میں بٹہ ضرور لگا دیا۔

آزاد مرحوم نے ہد ہد کو ایک نہایت بیوقوف شخص ظاہر کر کے اس کے کلام کو حکیم آغا جان عیش سے منسوب کیا ہے۔ حکیم صاحب کا سرمایۂ حیات ان کے دو دیوان ہیں۔ اور دونوں کے دونوں اس وقت میرے پاس موجود ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے کلام اور ہد ہد کے کلام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خوش مذاقی ان کو چھو کر نہیں گئی ہے۔ خدا نخواستہ کسی شعر میں مذاق کا پہلو اختیار کیا ہے تو سبحان اللہ۔ اس لکھنے سے نہ لکھنا ہی بہتر تھا۔ ان کے دونوں دیوانوں میں خوش مذاقی کے صرف چند ہی شعر ہیں، وہ سب کے سب لکھے دیتا ہوں، آپ خود اُن کے مذاق کو ہد ہد کی خوش مذاقی سے ملا کر دیکھئے اور انصاف کیجئے کہ کیا ہد ہد کی ہیچ میں حکیم صاحب کا دیا ہوا چھ لگا ہے، یا وہ یہ آذوقہ کہیں اور سے اُٹھا کر لایا ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں۔

حکیم صاحب کی خوش مذاقی

میٹھا جب ہو ہنڈ سنڈا یار کے در پر میں ہوں
کیوں نہ دعویٰ ہو مجھے یہ کہ قلندر میں ہوں

نہ چھوڑی شیخ جی صاحب کے سر پہ
سُنا، رندوں نے کل دستار باقی

تم نے سنا بھی ڈھایا ہے رندوں نے کیا ستم
لی شیخ جی کی بزم میں پگڑی اُتار رات

اسی پگڑی اُتارنے کے مضمون کو ذرا سید انشا کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

آتا ہے جی میں شیخ کی پگڑی اُتاریئے
اور تان کر چٹاخ سے اک دھول ماریئے

حضرتِ شیخ جی کل شب گرو مے کیلئے میکدے میں گئے تسبیح و مصلے لے کر:

یہی خیال میر صاحب کا بھی ہے، مگر کیا پاکیزہ رنگ میں ہے۔

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخر عمر میں ، میرؔ مے کی خاطر سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

اور تو اور استاد ذوق جیسے روکھے پھیکے آدمی نے اس مضمون میں کچھ تو لطف رکھا ہے۔

میکدے میں کل ہوئی ہے ایک پگڑی گرو مے
ذوق وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

حکیم صاحب کے یہ دو شعر ذرا مزیدار ہیں۔ اور کنایے ہی کنایے میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔

آگئے رندوں کے گر ہاتھ تو تم سن لینا
شیخ صاحب کو بتا دیویں گے آداب کے ڈھنگ

رند کہتے ہیں کریں گے ان کی خدمت ایک دن
شیخ جی صاحب کو جب شاید نصیحت ہو تو ہو

ایک جاٹ سر پر چارپائی لئے جا رہا تھا، ایک خاں صاحب بھی اُدھر سے گزرے، ذرا غور سے جاٹ کو دیکھا، مونچھوں پر تاؤ دیا، دماغ پر زور ڈالا اور تمام شاعری کا رس نچوڑ کر جاٹ کو ایک مصرعہ سنایا۔ ع "جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ" بھلا جاٹ کیا چوکنے والا تھا فوراً ہی جواب دیا۔ ع "خان رے خان تیرے سر پہ کولھو" خان صاحب کو بہت غصہ آیا اول تو جواب اور اس پر ایسا بے تکا جواب۔ کڑک کر بولے۔ ابے نامعقول تک تو ملا ہی نہیں۔ جاٹ نے کہا خان صاحب تک ملے نہ ملے بوجھوں تو مرو گے۔ بس اسی نمونے پر حکیم صاحب کے یہ شعر ہیں۔

شیخ کی شکل کسی سے نہیں ملتی لیکن
کچھ مشابہ ہے تو ہے صورت دجال کے ساتھ

جناب شیخ جی صاحب کو رند کہتے ہیں
کہ ان کی ذات جہاں میں ہے صورت خناس

کیا مکروہ مضمون ہے اور کیا بُرے الفاظ ہیں۔

عروس ڈھونڈھے ہے دنیا کی نت نیا جھگڑا
زیادہ سب سے بُرا ہے یہ اس چھنال میں نقص

ٹکڑے کر کر کے بنائی ہے لنگوٹی اپنی
لو یہ رندوں کو ہوا شیخ کی دستار سے فیض

ذرا ان کے معشوق کی زبان ملاحظہ فرمائیے۔

کل بدل تیوری کہنے لگے مجھ کو چل بے — نام چاہت کا مرے لیوے، ہوا تو ایسا

لیجئے یہ ہے حکیم صاحب کے دونوں دیوانوں کی خوش مذاقی کا خلاصہ، اس کے بعد بھی اگر آپ آزاد مرحوم کی اس تحریر کو صحیح سمجھیں اور یہ فیصلہ کریں کہ آغا جان عیش ہی ہدہد کو شعر لکھ کر دیا کرتے تھے اور اس لئے دیا کرتے تھے کہ اس زمانے کے اُستاد شعراء پر چوٹ کی جائے تو آپ جانیں اور آپ کا دین و ایمان جانے۔

حکیم صاحب کے کلام کی تلاش اور تذکروں میں ان کا ذکر

مجھے حکیم صاحب کے دیوان دیکھنے اور ان کے حالات معلوم کرنے کا شوق آبحیات نے دلایا۔ ورنہ تذکروں میں ان بچارے کا ذکر بہت کم آیا ہے۔ عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ "سخن شعرا" میں تحقیق حالات کی انتہا کر دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ "عیش تخلص۔ حکیم آغا جان باشندہ دھلی" اس کے ساتھ تبرکاً چار شعر بھی دیدیئے ہیں۔ "گلشن بیخار" میں تو ان کا نام آتے ہی کیوں لگا۔ مومن کے مدمقابل تھے۔ بھلا شیفتہ ان کا ذکر کس طرح کرتے۔ ہاں گلشن بیخار کے توڑ پر قطب الدین باطن نے جو "گلستان بیخزاں" لکھی ہے اس میں عیش کے حال میں دو چار سطریں اور ایک شعر لکھدیا ہے۔ عبارت ایسی ہے کہ اس سے کوئی نتیجہ نکالنا یا حال معلوم کرنا بے سود ہے ہائے کیا خوب فرماتے ہیں۔

"عیش تخلص حکیم آغا جان نام۔ حکیم سخن ان کے درمان کا محتاج مدام۔ طبیب طبع۔ مریضان مضمون کا معالج۔ خواہ کسی کو لقوہ ہو یا فالج۔ یہ نسخہ ہے یہ دوا۔ حکیم مطلق کے ہاتھ شفا"

دی تاسی کے تذکرہ شعرائے ہند اور کریم الدین صاحب کے "طبقات شعرائے ہند" میں عیش کا نام ہی نہیں ہے۔ البتہ مرزا قادر بخش "صابر" کی کتاب "گلستان سخن" میں ان کے بہت سے شعر بھی دیئے ہیں اور ان کے کلام پر ریویو بھی کیا ہے۔

جوئیندہ یابندہ

میں حکیم صاحب کے حالات معلوم کرنے کی اس اُدھیڑ بن میں تھا کہ ان کے پڑپوتے سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا دیوان لالہ سری رام صاحب رئیس دھلی مصنف خمخانہ جاوید کے پاس ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح یہ دیوان انکے خاندان سے نکل کر لالہ صاحب کے پاس پہنچا۔ ان واقعات کے اظہار کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ گذشتہ محرم میں مجھے دھلی جانا پڑا۔ شام کو ریل سے اُترا صبح ہی لالہ صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ خود میرا مضمون "۱۲۶۱ھ میں دھلی کا ایک مشاعرہ" دیکھکر مجھ سے ملنے کے مشتاق تھے۔ بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں حرف مطلب زباں پہ لایا۔ انہوں نے کہا کہ دیوان کی نقل میں نے کرالی تھی۔ وہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں۔ بھجوا دونگا اس کے بعد میں حیدرآباد چلا آیا۔ انہوں نے وہ نقل میرے پاس بھیج دی۔ دیوان کا آخری حصہ نقل کرنے سے رہ گیا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ بھی آگیا۔ یہ خوشامد نہیں واقعہ ہے۔ اگر کسی کو دھلی کی

پرانی صحبت دیکھنی ہے تو لالہ سری رام صاحب سے جا کر ملے جس خلوص اور محبت سے ملتے ہیں اور جس طرح زبان اُردو پر جان دیتے ہیں اس کا لطف کچھ ان سے مل کر ہی آسکتا ہے۔ قلم سے اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ خیر ایک دیوان تو مجھے لالہ صاحب سے ملا۔ دوسرا دیوان خود حکیم صاحب کی پوتی کے پاس تھا۔ وہ ان سے لیا اور اس طرح حکیم صاحب کا پورا کلام میرے پاس آگیا۔ اب رہے حالات تو وہ خود ان کی پوتی سے زیادہ کون بتا سکتا تھا۔ جب حکیم صاحب کا انتقال ہوا۔ اس وقت یہ خاصی جوان تھیں۔ اُن کی ایک ایک بات ان کو یاد ہے۔ بہت کچھ حالات ان سے معلوم کئے تھوڑے بہت واقعات کا خود ان کے دیوان سے پتہ چلا۔ غرض یہ معلوم ہو گیا کہ حکیم صاحب کون تھے اور کیا تھے۔

ہاں ایک چیز کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب آب حیات میں سے حکیم صاحب کا حال ان کی پوتی کو سنایا تو وہ تعجب سے پوچھنے لگیں "وہ میاں جنہوں نے یہ کتاب لکھی ہے کیا انہوں نے دادا جان کو دیکھا تھا۔ یا جو جی میں آیا لکھ دیا" لیجئے یہ ہے آزاد مرحوم کی تحریر کے متعلق خود حکیم آغا جان عیش کی پوتی کی رائے۔

آب حیات میں حکیم صاحب کے حالات

آب حیات میں حکیم صاحب کے متعلق آزاد مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد جو حالات مجھے معلوم ہوئے ہیں وہ لکھوں گا مقابلہ کر کے نتیجہ آپ نکال لیجئے۔

"حکیم آغا جان عیش۔ بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے۔ زیورِ علم اور لباس"
"کمال سے آراستہ۔ صاحب اخلاق۔ خوش مزاج۔ شیریں کلام۔ شگفتہ صورت"
"جب دیکھو یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسکرا رہے ہیں۔ ساتھ اس کے شعر کا عشق"
"تھا۔ طبیعت ایسی ظریف، لطیف اور نکتہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان"
"کہتے ہیں۔ غزل، صفائی کلام، شوخی مضامین اور حسن محاورہ سے کہیو نکی"
"چھری ہوتی تھی۔ اور زبان گویا لطائف و ظرائف کی پھلجھڑی۔ میں نے دو"
"دفعہ اُستاد کے ساتھ مشاعرے میں دیکھا تھا۔ ہائے افسوس اس وقت"
"تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ میانہ قد۔ خوش اندام، سر پہ ایک ایک انگل بال"

"سفید۔ ایسی ہی ڈاڑھی۔ اس گورے سرخ و سفید رنگ پر کیا بھلی معلوم ہوتی"
"تھی۔ گلے میں ململ کا کرتہ، جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ میں ان دنوں"
"دھلی کالج میں پڑھتا تھا۔ استاد مرحوم کے بعد ذوق سخن اور ان کے کمال"
"کی کشش نے کھینچ کر ان کی خدمت میں پہنچایا۔ اب ان صورتوں کو آنکھیں"
"ترستی ہیں اور نہیں پاتیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے چند روز بعد دنیا سے انتقال"
"کیا۔ خدا مغفرت کرے۔"

حکیم صاحب کے متعلق میری دریافت۔

حکیم آغا جان عیش کے والد کا نام حکیم علیمی خاں اور دادا کا نام حکیم خواجہ عبدالشکور خاں تھا۔ پشتینی حکیم تھے۔ یہ خاندان بخارا کی طرف سے آکر کشمیر میں بسا، وہاں سے دھلی آیا ذات کے مغل اور عقیدے کے لحاظ سے سنی المذہب تھے۔ حکیم علیمی خاں کے ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے آغا جان تھے اور انہیں کی وجہ سے خاندان کا نام روشن ہوا۔ چنانچہ اب تک انہیں کی وجہ سے دھلی میں چیلوں کے کوچے میں حکیم آغا جان کا چھتہ مشہور ہے۔ ایک منزلہ مکان تھا۔ زنانے میں دالان در دالان۔ سامنے کے حصے میں دو چھتی۔ بہت بڑا صحن۔ باہر اکہرا دالان۔ دالان کے سامنے سائبان۔ صحن باہر کا بھی بڑا تھا۔ صحن میں چمن تھا۔ اور جا بجا درختوں میں اناج پانی کے بھرے ہوئے کونڈے لٹکے رہتے تھے۔ کبوتروں۔ چڑیوں۔ طوطوں کے غول کے غول اور جھلڑ کے جھلڑ آتے، دانا پانی کھاتے پیتے اور چلے جاتے، حکم تھا کہ کسی وقت کوئی کونڈا خالی نہ رہے۔

مطب

صبح سے بارہ بجے تک مطب کرتے۔ ضرورت ہوئی تو کبھی کبھی شام کو بھی مریضوں کو دیکھ لیتے غریبوں سے بڑی محبت کرتے۔ اسی وجہ سے انکا مطب ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔ خود بھی اس پر فخر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پا کے صحت تجھے دیتے ہیں دعا عیش، غریب
دیوے اللہ ترے ہاتھ میں تاثیر سوا

روزگار سے بے فکر تھے اس لئے یا تو علاج معالجے میں لگے رہتے۔ یا شعر شاعری کرتے یا بیٹھے اللہ اللہ کیا کرتے۔ اپنی اس فارغ البالی کے متعلق اپنے کلام میں کہیں کہیں اشارہ کیا ہے۔

ترے آرام کو اللہ نے عیش
مہیا کر دیئے اسباب کیا کیا

ملازمت

نواب صاحب جھجر کے ہاں ملازم تھے۔ بس نام کے ملازم تھے۔ کبھی ضرورت پڑی تو چلے گئے نہیں تو گھر بیٹھے تنخواہ لیتے تھے۔ قلعے سے بھی تعلق تھا۔ بادشاہ کے لڑکے شاہ رخ مرزا کی ڈیوڑھی سے کچھ مل رہتا تھا۔ چنانچہ ایک قصیدے میں اس کا ذکر ہے۔

کروں جو صفحۂ کاغذ پہ تیری مدح رقم — عجب نہیں ہے کہ ہو دُر فشاں زبان قلم
نہ فیض عام ہو کس طرح تیرا عالم میں — خدا نے تجھ کو بنایا ہے صاحب عالم
ترا وہ رتبۂ عالی ہے شاہ رخ مرزا — نہ ہو سکے ترے ہم جنب رتبۂ رتبۂ جم
ترے ہی ناخن تدبیر سے جہان میں آج — کھلے ہے عقدہ کار جہاں خدا کی قسم
اب آگے عرض مری تجھ پہ آپ روشن ہے — زباں پہ نہیں لایا۔ اسی سے ہے مبہم
پر اتنی عرض ضروری ہے۔ سب ہیں سرسبز — میں تشنہ کام رہوں ایک اصحاب کرم

پھر بادشاہ سلامت کے حکم سے مرزا فرخندہ شاہ کی سرکار سے تعلق ہو گیا۔ اس واقعے کو ایک دوسرے قصیدے میں ظاہر کیا ہے۔

نہ کیوں ہو تیری عنایت کا مجھکو شکر ضرور — کہ تیرا شکر ہے بس عین شکر رب غفور
ادائے شکر ترا گرچہ غیر ممکن ہے — مگر میں حکم الٰہی سے ہوں شہا مجبور
ملا علوفہ ترے خانہ زاد کو شاہا! — تصدق سر اقدس۔ موافق دستور
علاوہ اس کے عنایت ہوئی غلام پہ یہ — کہ جس کا حال ہے اس قطعے میں ہوا مذکور
جناب میرزا فرخندہ شہ کی خدمت میں — کیا حضور نے اس خانہ زاد کو مامور

اس کے بعد بڑھتے بڑھتے شاہی طبیب ہو گئے۔ ہر دوسرے روز قلعے سے پالکی آتی تھی۔ اس میں بیٹھ کر قلعہ جاتے۔ تھوڑی دیر وہاں ٹھیرے۔ کوئی مریض ہوا۔ اس کو دیکھ لیا۔ بادشاہ سلامت کو مجرا کیا۔ اور چلے آئے۔ قلعے سے تنخواہ ذرا مشکل سے ملتی تھی۔ غالب کو قصیدہ لکھنا پڑا جب کہیں جا کر تنخواہ ملی۔ بچارے عیش کے سر پر بھی یہی مصیبت آئی۔ اُنہوں نے بھی ایک قصیدہ لکھا۔ جب مشکل آسان ہوئی۔ لکھتے ہیں:۔

نسیم صبح ہوئی آج یہ نوید رسا — کہ ہے بہار کی آمد کا ہر طرف جلسا
جلوس شاہد گل کیلئے بچھایا ہے — صبا نے باغ میں فرشِ زمردی ہر جا

خیر بہار یہ حصہ لکھکر یہ دبیر خرد سے مل کر پوچھتے ہیں کہ حضرت آج یہ کیا چہل پہل ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی سالگرہ کا جلسہ ہے، اس کے بعد بادشاہ سلامت کی تعریف شروع ہوتی ہے اور پھر۔

یہ میں نے سُن کے کہا اس سے۔ اے دبیر خرد
خدا کے واسطے تدبیر کوئی مجھ کو بتا

کہ اس جناب مقدس میں، میں بھی حاضر ہوں
کہ جس کی ذات سے ہے کامیاب ارض و سما

کہا یہ اس نے کہ کیوں پوچھتا ہے تو تدبیر
ضرور اس کی تو بخشش کو کچھ نہیں حیلا

وہاں ہے بخشش عام اسکی بے سبب سب پہ
خصوص تو تو قدیمی ہے خانہ زاد اس کا

جو اس پہ بھی ہے تو پابند عالم اسباب
تو ایک بات بتاؤں تجھے میں، چل اچھا

خدا نے ذات بنائی ہے اس کی مستغنی کہ
اسے بس اور کسی شئی کی کچھ نہیں پروا

مناسبت ہو طبیعت کو تیری شعر سے گر
تو چند شعر دعائیہ کہہ کے تو لے جا

میں عرض حال کو اپنے سمجھ کے ترک ادب
زبان پہ نہیں لایا ہوں اب تلک شاہا

مگر یہ عرض کہ بے اس کے زندگی ہے محال
رکا ہے اگلے مہینے سے میرا درماہا

خدا ہی جانے کہ یہ کس نے گل کھلایا ہے
مجھے خبر نہیں۔ دریافت کر تو دادرسا

حلیہ — جب کوئی روزی سے بیفکر ہوتا ہے تو عمر گزارنے کیلئے ہمارے ہندوستانی بھائیوں کیلئے بس دو ہی طریقے ہیں۔ یا شعر شاعری کرنا۔ یا اللہ اللہ کرنا۔ حکیم صاحب نے دونوں راستوں کو اختیار کیا تھا۔ مطب سے فرصت ہوئی۔ کچھ لکھنے بیٹھ گئے۔ اس سے فارغ ہوئے تو تسبیح سنبھالی۔ سارا دن وظیفہ و ظائف ہی میں گزار دیتے۔ رات کو گیارہ بجے گھر میں آتے۔ کھانا کھاتے اور سو رہتے۔ چوبیس گھنٹے میں بس ایک ہی دفعہ کھاتے تھے۔ پھر بھی آخر وقت تک ان کے قویٰ میں فرق نہ آیا۔ کوئی (۹۸) برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ لیکن مرتے دم تک نہ کوئی دانت ٹوٹا۔ نہ بینائی کمزور ہوئی۔ ان کا حلیہ آزاد مرحوم کی زبانی سن چکے، اب ان کی پوتی کی زبانی بھی سُن لیجئے۔ بہت اونچا قد۔ نہایت سرخ و سفید رنگ نیچی گول بھروان ڈاڑھی، کتابی چہرہ۔ منڈا ہوا سر۔ ستواں ناک۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ شکل پر نور برستا تھا۔ ہمیشہ نیچی چولی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ آستینوں کے چاک کہنی تک کٹے ہوئے۔ کرتہ تمام عمر

انہوں نے کبھی نہیں پہنا۔ جاڑے میں فرغل یا دگلا استعمال کرتے تھے۔ فرغل تو عموماً گرمی چھینٹ کی ہوتی تھی۔ مگر دگلہ اکثر اودی کپڑے کا ہوتا تھا۔ ایک برکا پیجامہ پاؤں میں ٹھولاں جوڑے پنجہ کی ریشم کے کام کی جوتی۔ ہاتھ میں سبز رنگ کی جریب۔

ان کا زہد و تقوی

ان کے زہد و تقویٰ کا حال ان کے دیوان سے جا بجا کھلتا ہے۔ حضرت غلام محمد شاہ صاحب کے مرید تھے۔ مگر ہر بزرگ سے عقیدت تھی اکثر رباعیاں بزرگان دین کی شان میں لکھی ہیں حضرت امیر خسروؒ کی شان میں فرماتے ہیں۔

رباعی

اللہ نے دیا ہے تجھکو وہ رتبہ و جاہ — آتا ہے ترے در پہ ہر ایک حاجت خواہ
کر عیشؔ کے حق میں بھی دعا از رہ لطف — اے طوطیٔ بوستانِ محبوب اللہ

اپنے پیر کو اسطرح پکارتے ہیں۔

تو حال پہ میرے کر توجہ یا پیر — رہتا ہوں میں فکر سے نہایت دلگیر
کر حق میں دعا مرے کہ ہوں میں لاچار — بن آتی نہیں ہے مجھ سے کوئی تدبیر

آلِ رسول اللہ کے عاشق تھے۔ فرماتے ہیں۔

نہ کھاؤ تم غمِ دنیائے دوں مگر اے عیشؔ — جو کھاؤ غم تو غمِ آلِ مصطفےٰ کھاؤ

اولیاء اللہ کی محبت کی ضرورت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

محبت اولیاء اللہ کی آتی ہے کام آخر — کہ انکے نام میں اللہ کا آتا ہے نام آخر

ہے تو بے موقعہ مگر ایک اور شعر سنائے دیتا ہوں۔ یاد نہیں کس کا ہے۔ مگر خوب کہا ہے اور نقطے کے خوب ٹکڑے کئے ہیں۔

ظالموں اس سے ڈرو آہ کو جانو نہ حقیر — دیکھو اللہ میں ہے اس کا اثر ڈوبہ تین

رات دن صدقے نہ ہوں سو جان سے کیوں اس کے ہم
عیشؔ جس دل کو ہے عشق حضرت باری کا شوق

فقیروں سے خاص عقیدت تھی۔ پوری کی پوری غزل اس بارے میں لکھ گئے ہیں۔

نہ کر فقیروں سے تو چھیڑ چھاڑ دیوانے — نہ چھیڑ کر انہیں حق سے بگاڑ دیوانے

تو اپنے حق میں نہ بو ان کو چھیڑ کر کانٹے — یہ اپنے پیچھے نہ چمٹا تو جھاڑ دیوانے

تو اپنی طرح سے مردان حق کو مردہ نہ جان — یہ مرد وہ ہیں کہ ڈھا دیں پہاڑ دیوانے

جو اُن کی کرتا ہے کوئی جہان میں توہین — حق اُن کو دیتا ہی جڑ سے اکھاڑ دیوانے

جو غیر حق انہیں سمجھے ہیں عیش اُن کو سمجھ

کہ حق نے ان کو بنایا ہے آڑ دیوانے

معلوم ہوتا ہے کہ سالک کے دیکھنے والے تھے مجذوبوں سے کچھ شوق نہ تھا۔ اپنا عقیدہ یوں بیان کرتے ہیں۔

مست کیا جانے ہیں لطف مستی — لطف مستی کسی ہشیار سے پوچھ

ہاں بالکل سچ ہے، پی کر جو ہشیار رہے وہی کچھ پینے کا مزا جانتا ہے، اگر پی کر موری میں جا پڑے تو پینے کا کیا خاک لطف اٹھایا۔

سلوک کا طریقہ ایک رباعی میں اس طرح بتاتے ہیں۔

رباعی

گر طالب حق ہی چھوڑ دے لاف و گزاف — بغض و حسد و کینہ سے کر سینہ صاف

جب ہو چکے عیش بات یہ تجھ کو حصول — کر مصقلۂ ذکر سے دل کو شفاف

ایک جگہ دعا کرتے ہیں، دیکھنا کیا سوز و گداز ہے۔

جاں پہ میری کر۔ کرم یارب — دور کر دل سے میرے غم یارب

بغض و کینہ کو صفحۂ دل سے — دے مٹا میرے یک قلم یارب

ہم گنہگار تیرے بندے ہیں — تجھ سوا کہویں کس سے ہم یارب

مونس جاں و دل رہے میرا — ذکر تیرا ہر ایک دم یارب

اور رہ مستقیم پہ تیرے — رہے ثابت مرا قدم یارب

وعیش، تیرا ہے دور رکھ اس سے — درد و رنج و غم و الم یارب

تاریخ وفات

غرض یوں ہی اللہ اللہ کرتے کرتے ختم ہو گئے۔ مگر کب مرے، اس کا حساب لگانا مشکل

ہے۔ آزاد مرحوم فرماتے ہیں کہ غدر کے چند روز بعد انتقال کیا۔ حکیم صاحب کی پوتی کہتی ہیں کہ "اے ہے ابھی تھوڑے ہی دن تو ہوئے جب وہ مرے، اس وقت میرا سب سے چھوٹا بھائی تین سال کا تھا۔ کوئی ایک ہفتہ بیمار رہے۔ تپ محرقہ تھی۔ دل پر صندل میں بھگو بھگو کر کپڑے رکھے جاتے تھے، آخر میرانجی[1] کی گیارہ تاریخ کو ختم ہو گئے۔" غدر ۱۲۷۳ھ میں ہوا، اس کے بہت بعد تک وہ زندہ رہے۔ کیوں کہ انہوں نے غالب کی تاریخ وفات کہی ہے۔ اس کے شروع کا حصہ پھٹا ہوا ہے۔

اور بڑے چین سے گزاری عمر جب تلک وہ یہاں مقیم ہوئے
اب جو یہاں سے وہاں گئے تو وہ عیش مورد بخشش کریم ہوئے
رکھتے دل خوش تھے وہ، سو بادل خوش داخل جنت نعیم ہوئے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۵ھ تک وہ زندہ سلامت تھے۔ سب سے آخری تاریخ جو ان کے دیوانوں میں ہے، اس میں انہوں نے منشی امنو جان کی تاریخ وفات لفظ "غفور" سے نکالی ہے۔ گویا ۱۲۸۶ھ یعنے غدر سے کم سے کم تیرہ سال تک وہ بقید حیات تھے۔

اب ان کی پوتی صاحبہ کے بیان سے حساب لگائیے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام ڈاکٹر سعید جان ہے۔ اور اس وقت اُن کی عمر ۸۳ سال کی ہے، وہ ۳ سال کے تھے، جب حکیم صاحب کا انتقال ہوا۔ اس لحاظ سے اُن کا سنہ وفات ۱۲۹۷ھ پڑتا ہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر دو کم سو برس کی تھی۔ گویا اُن کا سنہ پیدائش ۱۱۹۹ھ یا ۱۲۰۰ھ تھا۔

انتقال کے بعد ترکمان دروازے کے باہر ناصر وزیر کی بارہ دری میں خواجہ میر درد کی پائینتی دفن ہوئے۔ پہلے پختہ مزار تھا۔ اب نشان مٹ کر مٹی کا ڈھیر رہ گیا ہے۔

اولاد | اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں۔ مگر چار بچوں سے بھی گھبرا گئے تھے۔ کہتے ہیں۔

کم ر شاخ کو توڑے ہے ثمر اس سوا لطف تاہل کیا ہے

---

[1] دہلی کی عورتوں نے مہینوں کے جو نام رکھے ہیں وہ بھی سُن لیجیے۔ ۱۔ محرم ۔۲۔ تیرہ تیزی ۔۳۔ بارہ وفاتیں ۔۴۔ میرانجی ۔۵۔ مدار ۔۶۔ خواجہ معین الدین ۔۷۔ رجب ۔۸۔ شب برات ۔۹۔ رمضان ۔۱۰۔ عید ۔۱۱۔ خالی ۔۱۲۔ بقر ید (بقر عید)۔

توڑ دے جبکہ شاخ ثمر ہی اس کا — کیا توقع رکھے اپنی کوئی اولاد سے اب

اسی مضمون کو استاد ذوق نے خوب باندھا ہے، فرماتے ہیں۔

توڑا کر شاخ کو کثرت نے ثمر کی — دنیا میں گرانباری اولاد غضب ہے

ان میں بھی اسی مصیبت کا غل مچاتے مچاتے مر گئے۔

مرا در وقت پیری بار اطفال — نہ وا حق بود حقّا ثم حقّا

فہا انا فی الغربۃ ذرعیا — یدق الظہر دقا ثم دقا

ترجمہ۔ اس عالم غربت میں بال بچوں کے بوجھ نے میری کمر توڑ دی اور بُری طرح توڑ دی۔

ان کی شاعری پر غدر کا اثر

غدر کے بعد سے ان کی شاعری نے مرثیے کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ دلی والوں کو جو صدمہ دلّی کی تباہی کا ہوا۔ اس کا بیان کرنے سے دل بھر آتا ہے۔ بہادر شاہ کو بادشاہ کہو یا شاہ شطرنج۔ پھر بھی ایک قلعہ ہی تھا جو شریفوں کا ملجا و ماوی تھا۔ ہر کسی کا قلعہ سے کچھ نہ کچھ تعلق تھا۔ سلطنت نہ تھی۔ پھر بھی سمجھتے تھے کہ سلطنت ہماری ہے۔ اور کیوں نہ سمجھتے، مال گروی رکھنے کے بعد بھی گروی کرنیوالے ہی کا رہتا ہے، خواہ سود اور اصل ملا کر مال کی قیمت سے بڑھ ہی کیوں نہ جائے بادشاہ کیا گئے، دلّی والوں کا دل مر گیا۔ اپنا درد دوسروں کو سُنا سنا کر خود روتے تھے، دوسروں کو رُلاتے تھے۔ غرض یوں ہی روتے روتے تمام ہو گئے اور ہم کو رُلانے کے لئے اپنا کلام چھوڑ گئے۔ غدر کے کئی برس بعد دلّی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ اس میں کوئی طرح نہیں دی تھی۔ بس یہی تھا کہ دلّی کا مرثیہ کہو غزل میں کہو، چاہے رباعی میں، مخمس میں کہو چاہے مسدس میں۔ یہ کل کلام ایک کتاب کی شکل میں چھپا ہے اور ڈھونڈھنے سے ملتا ہے۔ اسی مشاعرے میں داغ مرحوم نے اپنا شہر آشوب پڑھ کر سننے والوں کو تڑپا دیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دہلی — بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دہلی

جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دہلی — مگر جو دیکھی حقیقت تو خواب تھی دہلی

ٹھری ہیں آنکھیں جو پہلے جگہ تھی نرگس کی

خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

دو بند اور سن لیجئے۔

کھلایا زہر ستم گر نے پان کی بدلے — پلایا خون جگر پیچوان کے بدلے
نصیب دار ہوئی ہے نشان کی بدلے — ملا نہ گور گڑھا بھی مکان کے بدلے

یہ دعوت فلک کینہ ساز تو دیکھو
اور اس پہ اس ستم آرا کے ناز تو دیکھو

الٰہی بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں — کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے مانگیں تو خرمن شرارے ہو جائیں — جو پانی چاہیں تو دریا کنارے ہو جائیں

پئیں جو آب بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو مانگیں رحمت باری تو قہر ہو جائے

اس مشاعرے میں مفتی صدرالدین صاحب آزردہ بھی شریک تھے۔ انہوں نے دہلی کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہوا اچھا جو مٹا نام و نشان دہلی
کس کی یا پرسش بنے مرثیہ خوان دہلی

تو خیر اس مشاعرے میں حکیم آغا جان عیش نے بھی بہت کچھ دلی کا رونا رو دیا۔ ایک شہر آشوب میں دلی کی شریف بی بیوں کی حالت زار لکھتے ہیں۔

فلک کی آنکھ نہ تھی جن کو دیکھنے پاتی — نہ تھی مجال صبا کی جو ان تلک جاتی
خدا نے دی تھی انہیں ایسی عصمت ذاتی — کہ نام غیر جو سنتیں تو ان کو شرم آتی

فلک نے بخشا ہے ان کو لباس عریانی
ہے ستر ان کے لئے ان کی پاک دامانی

دوسرے شہر آشوب میں قلعے کی بربادی کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

سر جھکاتا تھا جہاں آن کے سارا عالم — قبلہ و کعبہ سمجھتے تھے جنہیں اہل حشم
دست بستہ جہاں حاضر تھی سدا شوکت جم — دفعتاً ان سے ہوا ایسا زمانہ برہم

آج تو نان شبینہ کو بھی محتاج ہیں وہ
کل گدا بھی کوئی ایسا نہ تھا جو آج ہیں وہ

شرفا کے گھرانوں کی تباہی کا یوں رونا روتے ہیں۔

تھا وہ جن لوگوں کے ہاتھوں کی نزاکت کا یہ حال　　بار سے رنگ حنا کے وہ ہوئے جاتے تھے لال

پھول خواب مخمل سے کف پا کو بھی تھا جنکے ملال　　میلے ہوتے تھے نظر کرنے سے وہ چاند سے گال

اب وہی لوگ ہیں اور بادیہ پیمائی ہے

ملگئی خاک میں سب میری وہ مرزائی ہے

غرض دوسرا دیوان تقریباً سارے کا سارا اسی رونے دھونے سے بھر دیا ہے۔ تھوڑا بہت نقل کئے دیتا ہوں۔ دل سے نکلی ہے دل میں اثر کریگی۔ ہاں جن کے دل کو لگی نہیں ہے وہ اس حصے کو چھوڑ دیں۔ یہ اہل درد کی صف ماتم ہے۔ بے درد خدا کیلئے یہاں سے اٹھ جائیں۔

جب دلّی بھری ہوئی تھی اس وقت کا رنگ دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں بلبل چہک رہا ہے۔

جو آکے جنت سے حور دیکھے زمین پہ فصل بہار دہلی

تو ہوے سو جاں سے بے تکلف یقین سمجھو نثار دہلی

جہاں کی جو خوبیاں ہیں ساری وہ سب ہیں دہلی کی سرزمیں میں

نہیں ہے کوئی دیار ہرگز جہاں میں مثل دیار دہلی

مبالغہ اس میں کچھ نہیں ہے جو نقش ارژنگ آکے دیکھے

تو گم ہو اس کی بھی دیکھ ستی ہیں ایسے نقش و نگار دہلی

دعا ہے یوں عیش خوش زباں کی بصد تضرع جناب حق میں

الٰہی عیش و نشاط و عشرت رہیں سدا ہم کنار دہلی

بادشاہ کے لئے قصیدے لکھتے ہیں۔ دعائیں دیتے ہیں۔

عیش آباد رکھے خالق اکبر اس کو　　کیونکہ ہے وہ دل تیمر کے نگیں کا ٹکڑا

سراج الدین غازی ہے سر آرا جو عالم میں　　نصیب اسکو اور اسکی ساری محفل کو ہو آرائش

یا ایک دفعہ ہی ایسی ہوا چلی کہ بساط الٹ گئی۔ زمانہ بدل گیا۔ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس ناگہانی

آفت کا جو کچھ اثر دلی والوں کے دلوں پر ہوا ہو - وہ کم ہے - ایک دفعہ ہی گھبرا کر کہتے ہیں کہ - ہیں

یہ ہوا کیسی چلی برہم زمانہ ہو گیا
حال دہلی اہل عالم میں فسانہ ہو گیا

دل کسی فرد بشر کا خالی اس غم سے نہیں
غم یہ شائع کو بکو خانہ بخانہ ہو گیا

ہر سر مژگاں نہ ہو فوارۂ خوں کس طرح
غم زدوں کے دل میں جب غم کا خزانہ ہو گیا

ایک ہو تو روئیے کس کس کو روئیں یاد کر
دیکھ کر اس حادثے کو دل دوانہ ہو گیا

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے آگے اپنے یہاں
دم کے دم میں درہم کچھ کارخانہ ہو گیا

آہ گلگونِ بہارِ گلشنِ دہلی کو عیش
موجۂ بادِ خزاں کیا تازیانہ ہو گیا

حالِ عالم آہ کیف و کم میں کیا تھا کیا ہوا
یا اولی الابصار دیکھو دم میں کیا تھا کیا ہوا

غدر میں بڈھے ہو چکے تھے - اس لئے لکھتے ہیں -

فصل خرمی و جوانی تو کٹی اس چمن سے
اب رہی پیری تو اس موسم میں کیا تھا کیا ہوا

پھر آپ ہی دل کو تسکین دیتے ہیں -

اے دل ناداں تو اس بات کا شاکی نہ ہو
رابطہ باہم دیکھ جام و جم میں کیا تھا کیا ہوا

آخر دوستوں کے غم میں روتے روتے تھک جاتے ہیں -

جز خداوند جہاں حالِ دل اپنا عیش اب
کس سے کہئے دوستوں کے غم میں کیا تھا کیا ہوا

عین غدر میں غزل کہی ہے، کوتوالی کے چبوترے پر پھانسیاں کھڑی ہوئی ہیں - لوگ لٹکائے جا رہے ہیں - حکیم صاحب دیکھ رہے ہیں اور رو رو کر کہہ رہے ہیں -

کوچۂ زلف میں لاکھوں کے گئے دل مارے
سرزمین ہند کی کیا عیش بلا خیز ہے آج

گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ الٰہی کیا سے کیا ہو گیا ایک مصیبت

ہو تو صبر کریں، اور وہ ہوں تو صبر کریں آخر اس غم پر کیسے صبر کیا جائے۔

یا الٰہی یہ ہوا دنیا میں کیسا انقلاب
اک زمانہ گردشِ چرخِ کہن میں آ گیا

معلوم ہوتا ہے کہ غدر ہی میں دہلی سے نکل گئے تھے۔ امن امان ہونے کے بعد دہلی آنا چاہتے ہیں۔ لیکن آنے کو جی نہیں چاہتا۔ جس گھر کو بھرا بھرایا چھوڑ گئے تھے اس کو ویران کن آنکھوں سے دیکھیں۔ دوست نہیں رہے جن میں مل بیٹھ کر غم غلط کریں یا کم سے کم آنسو بہا کر دل کو تسکین دیں۔

جب عندلیب چمن سے ہوا چمن خالی	تو آ بسے اسے پا، زاغ اور زغن خالی
تباؤ آ کے وطن میں بھلا لگے دل کیا	جب عیش ہو گیا یاروں ہی سے وطن خالی

دل لگی کہتے ہیں جس کو وہ تو ہے یاروں کے ساتھ
جب نہ وہ ہوں تو لگے دل پھر وطن میں کس طرح

ظفر کو یاد کرتے ہیں۔ اور دل پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ ایک شعر میں وہ کچھ کہہ گئے ہیں کہ ہزاروں مرثیے اس پر قربان ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں۔

عیش ہی کو کچھ نہیں صدمہ جدائی کا تری
مبتلائے غم ہے ایک عالم ظفر تیرے لئے

بادشاہ مر گئے۔ ان کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

رونق حضرتِ دہلی تھی اسی کے دم سے	بعد مرنے کے کھلی سب پہ ظفر کی خوبی[1]

---

[1] اس شعر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بہت بعد تک حکیم صاحب زندہ رہے۔ ظفر کا انتقال رنگون میں ۱۲۷۹ھ میں ہوا۔ غدر ۱۲۷۳ھ میں ہوا تھا۔ حکیم صاحب کے دوسرے دیوان میں ظفر کے انتقال کی تاریخ درج ہے۔ غدر ہونے، بادشاہ کے قید ہونے، رنگون بھیجے جانے اور وہاں وفات پانے کو فارسی میں نظم کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دیوان میں یہ حصہ اس طرح پھٹ گیا ہے کہ اس کا نقل کرنا دشوار بھی ہے اور بے کار بھی۔

سچ ہے قدر نعمت بعد زوال۔

دہلی کا حال زار اُنہوں نے اپنے دوسرے دیوان میں اس طرح رو رو کر بیان کیا ہے کہ پڑھنے سے رونا آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

نہیں حال دہلی سُنانے کے قابل ۔۔۔ یہ قصّہ ہے آنسو بہانے کے قابل
اُجاڑے ہیں وہ قصر ایک ایک اس کے ۔۔۔ جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
نہ خوش آئی آبادی اس کی فلک کو ۔۔۔ نہ تھے ور نہ وہ تو مٹانے کے قابل
کیا آہ برباد چُن چُن کے اُن کو ۔۔۔ نہ تھے جو کہ برباد جانے کے قابل
ملایا جنھیں خاک میں تو نے وہ تو ۔۔۔ نہ تھے خاک میں یوں ملانے کے قابل
ستم سا ستم تو نے ڈھایا ہے ظالم ۔۔۔ نہیں بات یہ مُنہ پہ لانے کے قابل
کہیں ہیں سب احباب دہلی کو چلیے ۔۔۔ رہی ہے کہاں اب وہ جانے کے قابل
جسے دیکھ کہتے تھے ستّلح عالم (ق) ۔۔۔ یہ ہے جائے آرام پانے کے قابل
اسے دیکھ بلبل بھی کہتی ہے یہ جا ۔۔۔ نہیں آشیاں اب بنانے کے قابل
سنا جس نے یہ حال افسوس کھایا ۔۔۔ یہ ہے حال افسوس کھانے کے قابل
دُکھائے ہیں افسوس وہ دل فلک نے ۔۔۔ نہ تھے دعیش، جو دل دکھانے کے قابل

اسی زمین میں ظفر کے دو شعر بھی سُن لیجئے۔ یہ رنگون میں انہوں نے کہے تھے۔ اِن کے پوتے کی زبانی سنے تھے۔ ہائے فرماتے ہیں۔

نہ گھر ہی رہا ان کے آنے کے قابل ۔۔۔ نہ ہم ہی رہے وہاں کے جانے کے قابل
نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفر ہے ۔۔۔ فقط اشک حسرت بہانے کے قابل

حکیم صاحب خدا سے دعا کرتے ہیں اور مشورہ بھی دیتے ہیں۔

الٰہی بسا پھر تو اپنے کرم سے ۔۔۔ اسے۔ کیوں کہ ہے یہ بسانے کے قابل

اپنے کلام میں جابجا لکھنؤ والوں پر چوٹیں کی ہیں۔ مگر لکھنؤ کی تباہی نہ دیکھ سکے۔ دل بھر آیا۔ دلی کو رو رہے تھے۔ لکھنؤ کی مصیبت پر بھی آنسو بہانے لگے۔ سچ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر ٹھیس بہت جلدی لگتی ہے۔

ہوگیا ویران دھلی اور دیار لکھنؤ — اب کہاں وہ لطف دہلی اور بہار لکھنؤ

جو تھے دہلی میں عمائد، ہو گئے یکسر خراب — اور تباہ سارے ہوئے صاحب وقار لکھنؤ

تھا خس و خاشاک دھلی غیرت صد لالہ زار — رشک صد گلزار تھا ایک ایک خار لکھنؤ

غم میں دھلی کے گلوں کے تو گریباں چاک ہیں — اور سوسن ہے چمن میں سوگوار لکھنؤ

ٹکڑے ہوتا ہے جگر دھلی کی صدمے سُن کے عشق — اور دل پھٹتا ہے سُنکر حال زار لکھنؤ

حکیم صاحب کے دو شعر لکھتا ہوں۔ ذرا دوسرے شعر پہ غور کیجیے، کیا بات پیدا کی ہے۔

ہند لکھتے ہیں جسے، ملک سلیمان ہے یہ — مل گیا خاک میں، اس پہ بھی پرستان ہے یہ

بلبلیں کہتی ہیں، صیاد کا احسان ہے یہ — کہ یہیں چھوڑ دے یہ کہہ کے گلستان ہے یہ

دلّی لٹ چکی ہے، یہ باہر کسی گاؤں میں پڑے ہیں، وہاں سے لکھتے ہیں کہ اے صیاد بڑا احسان ہوگا اگر تو ہم کو اس اجڑے دیار میں آنے ہی کی اجازت دیدے۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ دلی اب دلی نہیں رہی۔ گلستان اُجڑ کر ویرانہ ہوگیا۔ مگر تو یہ کہہ کر ہم کو وہاں چھوڑ دے کہ "لو یہ تمہاری دلّی ہے" ہم خود یہ سوچ کر دل بھلانے کو پتہ چلالیں گے کہ "وہ یہاں غنچہ یہاں گل تھا۔"

غرض دوسرا دیوان سارے کا سارا انہی شہر آشوبوں سے بھرا ہوا ہے۔ روتے ہیں اور دعا کرتے۔ پھر روتے ہیں پھر دعا کرتے ہیں۔

پھلے پھولے الٰہی پھر کے شاخ گل تو اچھا ہو
بھرے پھر الٰہی گیلی باغ میں بلبل تو اچھا ہو

دلّی پھر آباد ہوئی۔ مگر حکیم صاحب کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

سلسلۂ شاگردی | حکیم صاحب کے استاد کا نام قیامت تک معلوم نہ ہوتا اگر انہوں نے خود اپنی ایک غزل میں استادی نہیں۔ اُستاد کے اُستاد بلکہ ان کے بھی اُستاد کا ذکر نہ کر دیا ہوتا۔ لکھتے ہیں۔

مجرم[51] کا میں شاگرد وہ بیدار[52] کے شاگرد — ہے و عیش، سلسلہ مرا یوں درد[53] و اثر[54] تک

---

[51] "مجرم" تخلص۔ رحمت اللہ نام آگرے کے رہنے والے تھے۔ کندہ کشی کرتے تھے۔ پھر فقیر ہو گئے۔ پھرتے پھراتے

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ

عجیب اتفاق ہے کہ مرے بھی تو دادا استاد ہی کے پائینتی جا پڑے۔

کلام | ان کا پہلا دیوان ان کے شاگرد میاں غمگین نے جمع کیا ہے۔ یہ وہ دیوان ہے جو لالہ سری رام صاحب دہلوی کے پاس ہے۔

سعیِ 'غمگیں' سے فراہم ہوا دیوان ورنہ
تھا پڑا یوں ہی کلام 'عیش' پریشاں اپنا

یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ 'عیش' کا دیوان اور 'غمگین' جمع کریں۔

دوسرا دیوان جو اُن کی پوتی کے پاس ہے وہ خود اُن کا مرتب کردہ ہے۔ اس میں جا بجا خود ان کے قلم کی اصلاح بھی ہے اور اضافہ بھی۔ یہ دیوان نہایت خوش خط لکھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں خود حکیم صاحب نے اپنے قلم سے ردوبدل کیا ہے۔ کہیں کوئی شعر ہو گیا تو وہ بڑھا دیا۔ ان کا خط ایسا ہے جیسا دھلی کے حکیموں کا ہوتا ہے۔ نہایت شکستہ۔ نقطے اس سرے سے اُس سرے تک سب ندارد۔ اب اس دیوان کا اللہ ہی مالک ہے۔ کاغذ سخت ہو کر تڑخنے لگا ہے۔ ہاتھ لگا اور کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں آ گیا۔ بعض صفحوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲)

دھلی آئے۔ "بیدار" کے شاگرد ہوئے۔ کچھ دنوں دہلی میں رہے۔ یہاں سے بریلی چلے گئے۔ بڑے ظریف اور طباع تھے ان کی زبان اور طرز بیان کا رنگ دیکھ لیجئے۔

نگہ ذر دیدہ کیوں پھینکے ہے تو اے امت عیسیٰ
دل و سینہ کو توڑے ہے یہ پستول فرانسیسی
یہی ہے آرزو رو رو کے جراحیں اپنی اے 'مجرم'
علی کی غاشیہ داری ہو اور دُلدُل کی سائیسی

؎ میر محمدی نام "بیدار" تخلص۔ عرب سرائے دہلی میں رہتے تھے۔ خواجہ میر "درد" کے شاگرد تھے۔ خواجہ اثر سے بھی اصلاح لی تھی۔ فارسی کلام مرتضیٰ علی بیگ "فراق" کو دکھاتے تھے۔ میر اور مرزا کے ہم عصر تھے اور ان لوگوں میں تھے جنہوں نے اردو کو رعایت لفظی کے پھندوں سے نکال کر اور مانجھ کر بے ساختگی اور دلاویزی پیدا کی۔ ان کے کلام میں صفائی اور تصوف کی جھلک ہے۔ ۱۷۹۳ء میں آگرہ گئے اور وہیں ۱۷۹۷ء میں انتقال کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

پر ان کے پڑپوتے میاں وحیدالدین نے گلکاری کی ہے اور بعض پر جلی قلم سے اپنا نام اور:-

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

لکھا ہے۔ آخر چند صفحے آڑے پھٹ کر آدھے رہ گئے ہیں۔ ظفر اور غالب کے انتقال کی تاریخیں بھی انہی پھٹے ہوئے ٹکڑوں کی نذر ہو گئی ہیں۔

لکھنؤ والوں سے بیزاری

خبر نہیں کیا بات ہے کہ حکیم صاحب لکھنؤ والوں سے بڑے بیزار تھے۔ دھلی اور لکھنؤ کی یوں تو ہمیشہ چلتی رہی ہے۔ مگر کسی نے اس طرح صاف صاف لکھنؤ والوں کو برا نہیں کہا جس طرح انہوں نے کہا ہے۔ ایسی کھُلی کھُلی چوٹ کرتے تھے کہ خدا کی پناہ، فرماتے ہیں:-

صبا گزر ہو اگر تیرا لکھنؤ کی طرف تو اتنا کہیو تو واں کے زباں دانوں کو
کہ گر ہزار برس۔ آتی بات یاد رکھو اس آرزو میں کھپاؤ گے اپنی جانوں کو
کہ اہل دھلی کی تقلید ہم زباں میں کیں تو تم نہ پہنچو گے ان کی کبھی زبانوں کو

یہ تو ایک عام حملہ ہوا۔ اب شخصی حملہ دیکھئے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴۲)

جو کچھ تھا وظائف وادراد رہ گیا تیرا ہی ایک نام ہیں یاد رہ گیا
بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

ﷺ "درد" تخلص، خواجہ میر نام۔ بھلا ان پر کسی نوٹ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

ﷺ سید محمد میر۔ "اثر" خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ فن شعر میں انہی کے شاگرد ہوئے۔ زبان صاف اور مضمون تصوف میں ڈوبے ہوئے۔ چھوٹی بحروں میں قیامت کی تحریر ہے۔ ان کی مثنوی خواب وخیال پہلے بہت کم ملتی تھی، اب انجمن ترقی اردو نے صحت کے ساتھ چھاپ کر زبان اردو پر بڑا احسان کیا ہے۔ ان کا دیوان لالہ سری رام صاحب دہلوی کے پاس ہے۔ چھپوانے کے لئے لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کسی نہ کسی دن دے ہی دیں گے۔

نالہ کرنا کہ آہ کرنا دل میں اثر اسکے راہ کرنا
کیا لطف ہے لیکے دل کرنا اور اُلٹا مجھے گواہ کرنا
جی اب کے بچا خدا کر پھر اور بتوں کی چاہ کرنا

ناسخ و آتش سے یہ کہہ دو کوئی تم نے بھلا   طرز عیش و حضرت ذوق و ظفر پائی کہاں

باوجود اس کے جب لکھنؤ تباہ ہوا تو یہ بغیر آنسو بہائے نہ رہ سکے ۔ اور دھلی کے ساتھ لکھنؤ کا مرثیہ بھی لکھ گئے ۔

میر تقی میر کی تعریف اور اس کی وجہ۔

میر صاحب کو سب ہی اُستاد مانتے چلے آئے ہیں ۔ اور ایک آدھ شعر میں ہر ایک نے ان کی استادی کو تسلیم کیا ہے لیکن حکیم صاحب کا یہ حال ہے کہ ان کے دونوں دیوان میر صاحب کی تعریف سے بھرے پڑے ہیں۔ چند شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہے سچ تو یہ شعرائے جہاں میں عیش فقط   کلام میر ہے البتہ دل پذیر اپنا

یوں تو سب مصری کی ڈلیاں ہیں مگر عیش اُستا   دل پسند اپنے ہیں ایک میر کے اشعار فقط

کیا زباں پائی تھی اس نے اور وہ کیا شخص تھا   حق تعالیٰ شاد رکھے عیش اس روح میر کو

یوں تو سب اچھے ہیں۔ پر مجھ سے جو تم پوچھتے ہو   دل پسند اپنے ہے طرز سخن میر فقط

ایک جگہ ذرا چلتے چلتے 'سودا' کی بھی تعریف کی ہے ۔ مگر اس میں بھی میر صاحب کو آدھے کا ساجھی بنا کر دیا ہے ۔

اے عیش اُستا۔ جہاں میں اب شخص   پیدا نہیں میر و میرزا سے

اسی طرح صرف ایک شعر لکھ کر خواجہ میر درد اور خواجہ 'اثر' کی تعریف کر دی اور بس ۔

آگاہ اس سے عیش اہل دل اہل درد ہیں   جو ہے کلام حضرت 'درد' و 'اثر' میں درد

میر صاحب کی اس تعریف میں بھی حکیم صاحب کی حکمت چھپی ہوئی تھی ۔ اپنی تعریف کرتے اور کن انکھیوں سے میر صاحب کی طرف دیکھ لیتے ۔ تمام دنیا سے تو لڑائی باندھ رکھی تھی ۔ آخر کوئی تو تعریف کرنے والا ہونا اس لئے ایسے شخص سے تعریف کے طالب ہوئے جس کی سب تعریفیں کرتے ہیں ۔

ہمعصر شعراء سے شکر رنجی

پہلے ان کی اور ان کے ہمعصر شعراء کی شکر رنجیوں کا حال لکھ دوں اس کے بعد ان کی

تعلیوا، کے اشعار لکھوں گا شعرا ہمیشہ زمانے کی ناقدری کا رونا روتے آئے ہیں۔ حکیم صاحب بھی
اسی گروہ میں شریک ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جو سخن سنج و سخن فہم تھے عالم میں سُنا
حیف صد حیف کہ اے "عیش" وہ انسان نہ رہے

ذرا دیکھنا کس خوبصورتی سے چوٹ کی ہے۔ شعر کے ایک معنی تو کھلے ہوئے ہیں کہ زمانے کے سخن سنج
اور سخن فہم مر گئے۔ دوسرے معنی "انسان نہ رہے" کے یہ نکلتے ہیں کہ وہ لوگ اب آدمی نہیں رہے
بلکہ سخن فہمی میں جانور ہو گئے ہیں۔ اسی مضمون میں دو شعر ایسے لکھے ہیں کہ سبحان اللہ۔ اور دوسرے
شعر میں قافیہ تو ایسا ڈھونڈ کر نکالا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

جہاں میں کیسی ہے بیقدری گُنی دیکھو
کبھی سنی نہ تھی سو اب وہ اَن سُنی دیکھو
تھے آگے نوبت و نقارہ جنکے ہاں سو اب
نئے وہ پھرتے ہیں ہاتھوں میں ٹُنٹُنی دیکھو

ذاتی مخالفتوں کا حال آب حیات میں موجود ہے۔ عین مشاعرے میں "غالب" پر چوٹ کرنا
اور ایسی چوٹ کرنا کہ منہ پھر جائے ہر اردو داں کے پیش نظر ہے۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
زبان "میر" سمجھے اور کلام "میرزا" سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ان کے علاوہ حکیم صاحب نے دیوان میں کئی جگہ اور بھی "غالب" پر حملہ کیا ہے۔

پسند کریں خواص اسکو سمجھ میں آئے عوام کی بھی
غرض ہو سب کے پسند خاطر یہی ہے خوبی کلام کی بھی

موسن خاں "مومن" کے نجوم پر بھی پردے پردے میں چوٹ کی ہے۔

وہ بے وقوف ہیں جو لکیروں کو ہاتھ کی

لکھتے ہیں سب ہے نوشتۂ تقدیر ہاتھ میں

اس کے علاوہ ملاحیاں تو خوب اڑائی ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

رباعی

کیں مصلحتیں جو دشمنوں میں ہیں گی
ٹھیرائی جو باتیں ہمتنوں میں ہیں گی
دل میں تو وہ کھوٹ اور ظاہر میں وہ لطف
یہ باتیں ہمارے ناخنوں میں ہیں گی

بظاہر کچھ تو باعث چاہئے آپس کی ان بن کا
عداوت اہل فن سے کس لئے ہے صاحب فن کو

"بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن" اور "القاص لایحب القاص" کا معاملہ ہے۔

اے ہمنشیں معاملہ تو چاہیئے تھا یوں
ہو مہر اہل مہر سے کیں اہل کیں کے ساتھ
یاں برخلاف اس کے ہے اہل جہاں کی رسم
ہے کینہ اہل مہر سے۔ مہر اہل کیں کے ساتھ

اسی مضمون میں فارسی کا ایک شعر ہے۔

دل را بدل رہیست دریں گنبد سپہر
از سوے کینہ کینہ و از سوے مہر۔ مہر

عیش، ابنائے جہاں میں ایک قلم سب کے سب گندم نما و جو فروش

ذرا ملاحظہ ہو کہ قلم کا رخ کس طرح اہل قلم کی طرف پھیرا ہے۔

تعلی

اب اس کے بعد دیکھئے کہ کس طرح حکیم صاحب تعلّی کی لیتے ہیں۔ اور میر صاحب کے پہلو میں جا کر چھپ جاتے ہیں:۔

مرشا عاشق، رہا انکار ملنے سے تجھے
آفریں، صد آفریں، ظالم نہیں، آتی تو ہو

دعیش، اس یہ شعر روح میر بولی قبر میں
اے خواک اللہ زباں سحر آفریں آتی تو ہو

ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:۔

چھڑے نہ بلبل کا آہ کیونکر بناوٗ تیر جفا سے پہلو
پڑی ہے گلشن میں دھوم دیکھو چھدا ہے گل کا صبا سے پہلو

اس غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:۔

نہیں سخن فہم اب کوئی دعیش، جو میر ہوتا تو داد دیتا
وہی سمجھتا کہ اس غزل میں بندھا ہے کس کس صفا سے پہلو

تعلّی کی اکثر لیتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ ایک غزل کہی ہے جس کا مطلع ہے:

سمجھ تو زیست کو اس عالم خراب میں خواب
زیادہ اس سے نہیں زندگی ہے خواب میں خواب

ایک مشہور مقولہ ہے کہ "زندگی ایک خواب ہے۔ حشر کے دن آنکھ کھلے گی" اسی کا یہ ترجمہ کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ اس مضمون کو ایک دوسری جگہ بھی ادا کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ہستی کا حال اپنے، بھلا تم سے کیا کہیں
دنیا میں آکے دیکھ گئے ایک خواب سا

اپنی اس کارگذاری پر ناز کر کے مقطع میں لکھتے ہیں:۔

کہی ہے تونے غزل جس ردیف و قافیہ میں
کہے تو دعیش، بھلا کوئی اب جواب میں خواب

اسی طرح ایک دوسری غزل میں فرماتے ہیں:۔

یہ جس زمین میں تونے غزل کہی اے دعیش،
کسی نے طرح کی ایسی کہی زمیں تو ہو

اس غزل میں ایک شعر بڑے لطف کا ہے۔ محاورے کو اس طرح بٹھایا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

سخی سے سوم بھلا جو ٹکا سا دیدے جواب
طلب پہ بوسے کے گر ہاں نہیں۔ نہیں تو سہو

اس تعلّی میں آخر بڑھتے بڑھتے حد سے بڑھ گئے ہیں:۔

کلام غیر ملے کب ترے کلام سے عیش، ہو ہم صفیر بھلا کیونکہ زاغ بلبل کا

خدا نے کی ہے عنایت زباں جو عیش تجھے
کسی نے نیند میں پائی کہاں زباں اتنی

کیا اچھا خیال ہے۔ نیند میں انسان اپنے آپ کو کیا کچھ نہیں دیکھتا۔ کہتے ہیں کوئی خواب میں بھی میری برابری کا خیال نہیں کر سکتا۔

سچ تو یہ بات ہے اے عیش کہ ہم پاتے ہیں
تیرے اشعار میں طرز سخن میر کی بو

اس کے بعد جو قلانچ ماری تو "میر" اور "میرزا" دونوں سے آگے نکل گئے۔ اور فرمانے لگے۔

محاورات و مضامین شستہ و رفتہ — وہ طرز "میر" اور طرز "میرزا" یہ ہے

سو عیش پاتے ہیں تیرے کلام میں دونوں
تری زبان میں اعجاز اک نیا یہ ہے

کلام کے نمونے

اچھا اب میں ان جھگڑوں کو چھوڑتا ہوں اور حکیم صاحب کے کلام کے نمونے پیش کرتا ہوں۔ قصیدوں کے کچھ نمونے اوپر دے چکا ہوں۔ صرف ایک قصیدے کا کچھ حصہ نقل کئے دیتا ہوں، اس لئے نہیں کہ یہ ان کا سب سے بہتر قصیدہ ہے، بلکہ اس لئے کہ اس سے اس زمانے کے جلوس شاہی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ قصیدے میں واقعات کا لانا۔ اور کسی مقام کا نقشہ کھینچنا مشکل ہے، اس کے لئے کچھ مثنوی ہی موزوں ہے۔ پھر بھی حکیم صاحب نے دربار کا نقشہ قصیدے میں کھینچا ہے اور خوب کھینچا ہے۔ ان کے کلام میں مجھے دو ہی چیزیں پسند آئیں۔ ایک قصیدہ، دوسرے پہیلیاں۔ اچھا تو وہ قصیدہ سنئے۔

جلوس شاہی

ہلال عید کو ہوتا کبھی نہ شرف کمال   رکاب سے ترے دیتے اگر نہ اُس کو شمال
اسی سے خلق میں ہے احترام اس کا شہا   کہ آئے ہے ترے پابوس کیلئے ہر سال

اس کے بعد ہلال کی تعریف اور اسی کی تشبیہیں دے کر ایک شخص سے سوال کرا دیا:-

کہ بس ہلال کی تو سن چکا حقیقت میں   مگر بیان تو کر مجھ سے عید کا احوال
وہ عید کیا ہے کہ جس کی خوشی ہے عالم میں   وہ عید کیا ہے کہ جس سے ہر ایک ہی خوشحال

اب یہ اس شخص کے سوال کا جواب دیتے ہیں۔

تجھے خبر نہیں گر عید کی حقیقت کی   تو میں بیاں کروں سن تو اے حمیدہ خصال
یہ عید جشن کا اس کے مقدمہ ہے سنا   اب اس کے جشن کا بھی حال سن لے با اجمال
کہ پہلے جشن سے ہوتی ہے تورہ بندی ہاں   جہاں میں پہنچے ہے ہر ایک کو اس کا خوان نوال
اور ایک رسم مقرر ہے پیشتر دو دن   جلوس جشن مبارک سے بھیگتی ہے دال
اور اسکے دوسرے دن اسکی پیس کر پیٹھی   بڑا کڑاہی میں ڈالے ہیں مل کے خیر سگال
اور اسکا تیسرا دن یعنی دن ہے شادی کا   کہ جمع ہوتے ہیں سب آکے دیکھنے کو جمال
اور حکم ہوتا ہے دربار عام کا اس دن   جو چاہے روکے کسی کو کوئی نہیں ہے مجال
ہے اس مکان کا دیوان خاص نام سنا   کہ جس میں ہوتا ہے یہ جلوہ ظہور جمال
رکھے ہیں پہلے وہاں لاکے تخت طاؤسی   وہ تخت چرخ بھی جس کا ہے پایۂ اجلال
حضور آکے پھر اس تخت عرش عظمت پر   جلوس کرتے ہیں با صد شکوہ و عز و جلال
پھر اسکے بعد مقرر ہیں جو قریشی[1] وہاں   کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح سب قرین و فضال
ہیں آگے سب سے ولیعہد عصر تخت کے پاس   بزیر سایۂ ظل خدائے با افضال
کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح شاہ رخ مرزا   بصد متانت و تمکین و عزت و اجلال
اور ان کے پاس کھڑے ہیں گے فخر دیں مرزا   بہ پیش تخت شہنشاہ دیں بریں منوال

---

[1] قریشی ان لوگوں کو کہتے ہیں جو خاندان شاہی سے ہوتے تھے یا جن کو تخت کے پاس تک جانے کی اجازت ہوتی تھی۔

جناب میرزا فرخندہ شاہ عالی قدر　　کہ ان پہ چشم عنایت حضور کی ہے کمال

کھڑے ہوئے ہیں وزیر الممالک اور بخشی　　ہر ایک اپنی جگہ شاد۔ غم سے فارغ بال

حکیم اور ارکین سلطنت سارے　　کھڑے ہوئے ہیں قرینے سے سب کمال کمال

کھڑے ہوئے ہیں مؤدب کہیں نظارت وال　　کہیں ہیں شیدی زمرد۔ کہیں کھڑی ہیں بال

خواص اپنے قرینے سے سب کھڑی ہیں نئے　　اوگالدان کوئی مورچھل کوئی رومال

ہیں ایک سمت کھڑے خوشنویس اور شاعر　　کھڑے ہوئے ہیں نجومی ہیں کہیں رمال

نجومیوں میں جو ہندو ہیں ان کا حال ہے یہ　　بڑھا بڑھا کے قدم۔ ہاتھ کو نکال نکال

وہ اپنی بولی میں آشیرباد دیتے ہیں　　کہ رکھے جلوہ یہ قائم سدا سری گوپال

اسی طرح سے غلامی میں اس کے حاضر ہیں　　کہاں تلک کہوں ہر ایک فن کو اہل کمال

بجے ہے ایک طرف ہیں ایک طرف قانون　　کوئی رباب بجاتا ہے اور کوئی کھڑتال

ہر ایک اپنی جگہ گاتے ناچتے ہیں کھڑے　　چمک چمک کے خوشی سے طوائف اور قوال

عجب طرح کا سماں بندھ رہا ہے کیا کہئے　　کہیں ہیں بھانڈ کہیں بھگتیے کہیں نقال

یہاں تلک کہ جو ہیں تخت پر بنے طاؤس　　خوشی سے ناچتے ہیں وہ بھی کھول کر پر و بال

قلار اپنی جگہ اس ہجوم خلقت میں　　لئے کھڑے ہیں بے اہتمام چھڑیاں لال

ہر ایک کا ہوتا ہے آداب گاہ سے مجرا　　بہ پیش گاہ شہنشاہ صاحب اقبال

کھڑے ہوئے ہیں وہاں چوبدار اور نقیب　　خوشی سے اپنی جریب اور چھڑی سنبھال سنبھال

پکارتے ہیں کہ آداب سے کرو مجرا　　جہاں پناہ سلامت کا ہو فزوں اقبال

ادھر سے گذرے ہے ملکوں کی پیشکش اور نذر　　ادھر سے ہوتے ہیں خلعت عطا فراخور حال

کہیں کھڑی ہیں سلامی کے واسطے توپیں　　کہیں کھڑی ہیں شترنال اور کہیں گھڑنال

اور اسکے صحن میں بس فیل کوہ پیکر بھی　　ہوئے ہیں مجرے کو حاضر لگا لگا کے ڈھال

اسی طرح سے جو حاضر ہیں اسپ خوش رفتار　　بھرے ہوئے ہیں حنا موتیوں سے انکے بال

اس کے بعد نہروں کا ذکر کرکے قصیدے کو دعا پر اس طرح ختم کیا ہے۔

الٰہی ہو وے یہ دعائیں یہ سب قبول مری　　بحق سورۂ یٰسین و سورۂ انفال

ان کے کلام پر ریویو

حکیم صاحب کے کلام پر ریویو کرنا مجھ جیسے کا کام نہیں ہے۔ نہ میں شاعر، نہ سخن سنج، نہ سخن فہم، مضمون لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس لئے کلام کے متعلق بھی کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ اور تو اور آزاد مرحوم نے تسلیم کیا ہے کہ یہ اُن لوگوں میں ہیں جنہوں نے اُردو زبان کو مانجھا اور اُس میں روانی پیدا کی ہے۔ "غزل صفائی کلام، شوخی مضامین اور حُسن محاورہ سے پھولوں کی ایک چھڑی ہوتی تھی اور زبان گویا لطافت اور ظرافت کی پھولجھڑی۔" مجھے آزاد مرحوم کے اس آخری جملے سے اتفاق نہیں ہے میرے خیال میں حکیم صاحب میں ظرافت کا مادہ تھا ہی نہیں۔ البتہ شعر میں محاورہ ایسا بٹھاتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ کلام میں صفائی ہے اور مضمون خوب پیدا کیے ہیں۔

مرزا قادر بخش "صابر" حکیم صاحب کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کا کلام صنائع لفظی سے آراستہ ہے۔ غزل میں محاورہ اور رشستگی زبان کا بہت خیال رکھا ہے۔ یہ بالکل سچی رائے ہے۔ اور ان کا کلام دیکھ کر آپ خود اس کا اندازہ کر لیں گے۔

رعایت لفظی

غدر سے پہلے دہلی والوں پر بھی لکھنؤ کا کچھ رنگ چڑھ گیا تھا۔ اور رعایت لفظی ان کے کلام میں بھی داخل ہو گئی تھی۔ ذوق کا کلام تو از اول تا آخر ان رعایتوں سے بھرا پڑا ہے۔ البتہ غالب اس رنگ کو بُرا سمجھتے تھے مگر وہ بھی اس ہوا سے نہ بچ سکے۔ اور "وہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں" لکھ ہی گئے۔ حکیم صاحب کے پہلے دیوان میں یہ رنگ موجود ہے۔ مگر ایسا ہے کہ بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے دیوان میں بھی رعایت لفظی کہیں کہیں برت گئے ہیں۔

اُس نے زخموں پہ کی نمک پاشی ہم سے حق نمک ادا نہ ہوا

خدا کے واسطے دیکھو تو یہ کیا کج ادائی ہے

سوال بوسہ پہ کہتے ہیں میں سیدھی سناؤں گا

سیدھی سنانا یا سیدھیاں سنانا گالی دینے اور بُرا بھلا کہنے کے معنوں میں آتا ہے۔

جام گل بادۂ عشرت سے جو لبریز ہے آج

چہچہا کرتی ہے بلبل کو نشہ تیز ہے آج

بڑا خوب صورت مطلع ہے۔ ایک ایک لفظ ایسا جما ہے کہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ عام طور سے بلبل کا چہچہانا کہتے ہیں۔ لیکن جو لوگ جانوروں کے شوقین ہیں، ان کے محاورے میں جب جانور بولنا

شروع کرتا ہے۔ اور تھوڑا تھوڑا بول کر چپکا ہو جاتا ہے اس کو ریز کرنا اور جب مسلسل بولے جاتا ہے تو
اس کو چہچہا کرنا کہتے ہیں۔ ہلہر کا ایک شعر ہے۔

جو آکے ریز کرے میرے آگے ہو سنفار   تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کر دوں

حکیم صاحب کے شعر میں ریز کے مقابلے میں چہچہا موجود ہے۔ مگر یہ رعایت لفظی اس طرح استعمال
کر گئے ہیں کہ ذرا غور سے سمجھ میں آتی ہے۔

ہاتھ کو پہلے تو اپنے کھینچ لے   پھر جدھر جا ہے تو لمبے پیر کر

آتش نے بھی اس مضمون کو لیا ہے۔ مگر یہ لطف پیدا نہ کر سکے۔ کہتے ہیں:۔

ہے سزاوار اہل دولت سے فقیروں کا غرور
ہاتھ کو جو کھینچ لے گا پاؤں کو پھیلائے گا

شعر کے اچھے ہونے میں شک نہیں مگر "جدھر جا ہے" کا زور نہیں آیا ہے۔ حکیم صاحب نے
دو محاوروں کو ایک شعر میں اس خوبی سے جمع کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ اہل قناعت کی بڑی
سچی تصویر ہے۔ اسی غزل میں ایک اور شعر کہا ہے اصبر کی بہترین تلقین ہے:۔

قافلے والوں سے کہہ دو تم چلو   ہم بھی آتے ہیں کوئی دم ٹھیر کر

آئینہ صاف دھوکے کی ٹٹی سے دیکھنا   باطن میں کوئی اس سا کدورت بھرا نہیں

آئینے کی رعایت سے صاف۔ ٹٹی سے دیکھنا۔ کدورت غرض کئی لفظ استعمال کر گئے ہیں۔ ٹٹی کا
آئینہ پتلے آئینے کو کہتے ہیں:۔

قصۂ بے سروپائی کو مرے سُن کے کہا
بات وہ کہئے کہ جس بات کا ہو کچھ سر پاؤں

دوسرا مصرعہ لاجواب ہے۔ پورا کا پورا محاورہ آگیا ہے۔ مگر پہلے مصرع کی بے سروپائی نے
شعر کو بدمزہ کر دیا ہے۔ ایک مکھیوں [illegible] ری غزل شاہ نصیر کی بھی ہے۔ حکیم صاحب نے بھی مکھیاں
ماری ہیں۔ مفت کی دماغ سوزی ہے۔ حاصل کچھ نہیں۔ کہتے ہیں۔

دور ہیں دیکھ کے کہتے ہیں تل کی مکھی   ہے حقیقت میں وہ پیغام اجل کی مکھی

کیا عجب، عیش، ترا حسن کے کلام شیریں   روح فرہاد نے تیری غزل کی لکھی

شیریں و فرہاد کو کسی نہ کسی طرح ملا دیا۔

محاورہ بندی: یہ میں بھی مانتا ہوں کہ حکیم صاحب محاورے کے استاد تھے۔ بعض جگہ تو محاورہ اس طرح باندھ گئے ہیں کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ زبان کی روانی اور اس میں محاورے کی نشست۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاندنی رات میں دریا کے پانی میں برف کے ٹکڑے بہے چلے جاتے ہیں۔ کوئی ان کا دیوان یاد کرلے تو محاوروں کا تو حافظ ہی ہو جائے غور سے پڑھئے اور داد دیجئے۔

عشق اور رشک چھپائے سے کہیں چھپتا ہے
درد دل لاکھ چھپایا پہ چھپایا نہ گیا

خدا کے واسطے کر ضبط نالہ اے بلبل   یہ زخم دل مرے جائیں کہیں نہ کھل بھر کے

طبیعت آپ کی رہتی ہے کچھ اداس اداس   خدا کے واسطے بہلاؤ عیش ہا جل بھر کے

سبحان اللہ۔ کیا مقطع ہے۔ کس کا منہ ہے جو اس کی تعریف کر سکے:۔

طلب وہ کرتے تھے دل تم سے عیش ہا یہ تو کہو
کہ اس معاملے میں تم سے اُن سے کیا ٹھیری

ایک غزل کی غزل محاوروں سے بھری پڑی ہے۔ مگر حکیم جی عاشق بھی عجیب تھے اور ان کا معشوق بھی عجیب تھا۔ یہ شاعروں کا معشوق نہیں ہے۔ یار لوگوں کا معشوق ہے۔

کہا جو رحم مرے حال پر ذرا کھاؤ   تو ہنس کے بولے کہ چلتے بنو ہوا کھاؤ
کہو یہ حضرت ناصح سے قبلہ و کعبہ   خدا کے واسطے جاؤ نہ سر مرا کھاؤ
جو اپنی شدت غم ان سے ہم لگے کہنے   تو بولے ہو کے خفا جاؤ سنکھیا کھاؤ
حصول اُن کی ملاقات سے نہیں کچھ اور   مگر یہ بات، کہ ہاں گالیاں سدا کھاؤ
بتاؤ تو سہی دیتے ہو اس سے کیوں اتنا   بلا دبے ہے۔ کسی کا نہ جب دبا کھاؤ

ایک اور غزل میں بھی محاوروں کو خوب بٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کہہ دو یہ حضرت واعظ سے کہ تم کام اپنا کرو۔ جاؤ۔ حضرت
بھولے بسرے تو کبھی رعیش کو بھی بزم میں اپنی بلاؤ حضرت

شب خواب میں معاملہ اس مہ جبیں سے تھا
وہ پٹ گیا۔ جو اپنے نہ وہم و گمان میں تھا

معاملہ پٹنا دکانداروں کی اصطلاح میں سودا بن جانے کو کہتے ہیں۔
ذرا دیکھنا کیا اُلٹ پھیر ہے۔

رعیش زلف اس رخ پہ چھٹتی ہے تو ہو جاتی ہے شام
اور اُٹھتی ہے تو ہو جاتا ہے تڑکا نور کا

نور کا تڑکا محاورے میں صبح صادق کو کہتے ہیں۔
اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ باندھا ہے۔ اور واقعی لاجواب باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہے زلف سے مکھڑے پہ طلسمات کا عالم
گر چھوڑ دیں تو ہو شام۔ اُٹھا دیں تو سحر ہو

ایک شعر سناتا ہوں۔ تعریف کیجئے گا۔ محاورے کا محاورہ ایک مصرعہ میں آگیا ہے۔
کیا جس کو ترک اس سے پھر کام کیا کہ چھوڑے ہوئے گاؤں کا نام کیا
نسیم نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر کہا۔ مگر:۔ مصرعہ
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام

بس دھواں دیکھا کیا پھر اس چرخ کج رفتار کا
چل گیا چھرا کوئی گر آہ آتش بار کا

چھرا چلنے کا محاورہ حکیم صاحب نے بہت جگہ باندھا ہے۔ بندوق نکل آئی تھی۔ تیر کمان

بے کار ہو گئے تھے۔ پھر یہ کیوں آہ کے تیر کی بجائے آہ کے چھرے نہ چلائیں۔

نہ رہا۔ ایکساں کسی کا روپ کبھی ہی چھاؤں اور کبھی ہی دھوپ

اچھی دھوپ چھاؤں ہے۔

ایک اور محاورہ سنئے۔ عامیانہ ہے مگر بڑے مزے کا ہے۔

دیکھے دل منہ تکیں ہیں جس لس کا نہ الٰہی کسی کو بے لس کر

وعلیش، یہ عاشقی ہے کھیل نہیں جو کرے کام ہو کے جو کس کر

تجارت پیشہ اشخاص کو آخری مصرعے سے بہتر کوئی نصیحت نہیں ہو سکتی۔

دیکھ حالت ترے بیمار غم ہجراں کی رہ گئے دانتوں میں انگلی کو مسیحا لیکر

"کو" بھرتی کا لفظ ہے اصل محاورہ دانتوں میں انگلی لینا ہے۔ استاد ذوق نے بھی اسی مضمون کو اسی زمین میں خوب باندھا ہے۔

تیرا بیمار نہ سنبھلا جو سنبھالا لے کر چپکے ہی بیٹھ رہے قم کو مسیحا لے کر

اے عندلیب دعوی بیہودہ کر نہیں ایک آدہ گل کا منہ نہ مسل دیں چمن میں ہم

ایک جگہ اور اسی طرح گل کا منہ مسلا ہے۔ کہتے ہیں:

ہمسری کی دہن یار سے گر غنچے نے تو ابھی باد صبا ڈالے گی منہ اس کا مسل

مگر یہ کچھ اچھی طرح منہ نہیں مسلا گیا۔ پہلا شعر لاجواب ہے۔ بندش بھی خوب ہے۔ اور "ایک آدہ" کے الفاظ نے شعر میں جان ڈالدی ہے۔

ایک خاص دلّی کا محاورہ سنئے بولتے سب ہیں لکھتا کوئی بھی نہیں۔

دم میں اس کے کہیں نہ آجانا کیوں، وہ دل لیکے پھر دوال نہیں

اس زمانے میں "کیوں" لفظ "کیونکہ" کی بجائے اکثر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں کیوں نے استفہامیہ ہو کر ایک عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ یار دوست کہتے ہیں اجی حضرت کہیں اس کے دم آ کر دل نہ دے

بیٹھنا - یہ پوچھتے ہیں - کیوں - وہ جواب دیتے ہیں - وہ دل لے کے پھر دیا نہیں کرتا -

---

ایک غزل کی غزل مرصع ہے - کیا بلحاظ محاورے کے اور کیا بلحاظ زبان کے -

جان ہم اپنی دیے بیٹھے ہیں　　سر ہتیلی پہ لیے بیٹھے ہیں
بول سکتے نہیں اُن کے ڈر سے　　ہونٹ ہم اپنے سیے بیٹھے ہیں

مقطع کہا ہے -

دعیش ہم کوچہ قاتل میں فقط　　سر فروشی کے لیئے بیٹھے ہیں

لفظ "فقط" کو دیکھیے - اس نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے -

---

گیا تھا میں تو انہیں درد دل سنانے کو
لگے سُنانے وہ الٹی مجھے ہی لو باتیں

"لو" کا لفظ کیا پیارا آیا ہے - صرف ایک لفظ سے عاشق کی کیا کیا گھبراہٹ اور پریشانی ظاہر کر دی ہے -

---

چھیڑ دے پھر ہاں ذرا اوکاوش مژگان یار
زخم دل کچھ کچھ ہمارے آج بھر سے آئے ہیں

صرف اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں کہ "کچھ کچھ" اور "بھر سے" نے شعر کو کیا سے کیا کر دیا ہے -
ہاں کیوں نہ ہو - استاد کا شعر ہے -

ہے تیرے مریض غم ہجراں کی یہ حالت
مانگیں ہیں دعا سب - یہ ادھر ہو کہ اُدھر ہو

ہائے کیا بیکسی کا عالم ہے اور کیا بُرا وقت ہے -

تم ایک مجنوں کو کیا پیٹتے ہو عشق میں عیش　　ہزاروں مجنوں سے رو بیٹھے اپنی جانوں کو

ایک شعر صرف محاورہ کے لئے کہا ہے۔ بندش بہت کمزور ہے۔

ہے جو یہ گھٹتی کا پہرا۔ قدر سب کی گھٹ گئی
نقص اس باعث۔ فنِ ہر اہل فن میں آگیا

یہ شعر بھی بس ایسا ہی پھس پھسا ہے۔

ایک عیب تو آئینے میں ہے پردہ دری کا
اور دوسرے لپکا ہے پریشاں نظری کا

دیکھنے والے ہیں اپنے ہی جہاں میں وہ بھی
قیس و فرہاد جو مشہور ہیں دیوانے دو

پیری مریدی کی اصطلاح میں "دیکھنے والے" مریدوں یا عقیدت مندوں کو کہتے ہیں۔

چاک دل سیو یگا کیا تو آکے میرا بخیہ گر — دھونڈتا اک اور پڑیگا بخیہ گر تیرے لئے
کان پر تیرے نہیں جوں بھی چلی ہے آج تک — جان سے اپنے گئے لاکھوں گزر تیرے لئے

پہلا شعر تو ایسا ہے کہ واہ واہ۔ یہ نہیں کہا کہ میں نوچ کھسوٹ کر تیرے کپڑوں کی دھجیاں کردونگا صرف یہ کہکر اشارہ کر دیا کہ خود آپ کے لئے بخیہ گر بلوانا پڑے گا۔ دوسرے شعر میں دو محاورے آگئے ہیں، مگر پہلا محاورہ تو ایسا ہے کہ لکھنے سے اس کا نہ لکھنا ہی بہتر تھا۔ اسی طرح ایک قطعے میں کئی محاور لائے ہیں۔ مگر بس ٹھوس ٹھاس ہے۔

معلوم ہیں سب ان کے فریب دلکش وہ جھوٹے — باتیں کہو کس روز بنایا نہیں کرتے
دکھلاتے نہیں باغ بھلا سبز وہ کس دن — کب ہاتھ پہ سرسوں وہ جمایا نہیں کرتے

فارسی کا اثر — حکیم صاحب کے بعض شعر ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا کسی فارسی شعر یا ضرب المثل کا ترجمہ کر دیا ہے ایسا کیا تو کیا برا کیا۔ خدا کرے ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوں، جو دوسری زبانوں کے خیالات سے اردو کا مال خانہ بھر دیں۔ جب ہم ہر زبان کا لفظ اردو میں لینے کو موجود ہیں تو پھر ان زبانوں کے خیالات لینے میں کیوں شرمائیں۔ لوگ اسکو چوری کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ مال موذی نصیب غازی۔

توہاں اب حکیم صاحب کی چوری دیکھیے۔

میرے بہکانے کو بدلے لاکھ روپ اس نے مگر
میں نے پہچانا اسے وہ جس برن میں آگیا

فارسی کا شعر ہے:۔

بہر رنگی کہ خواہی جامہ برپوش — من انداز قدت را می شناسم

یقیناً عیش کا شعر اس فارسی کے شعر سے بڑھا ہوا ہے۔ اس میں معشوق کی شناخت کا دارو مدار محض قد پر رکھا ہے اور کیوں جی اگر وہ اونچی ایڑی کا جوتا پہنکر آجائے تو یہ ایرانی صاحب اسکو کیونکر پہچانینگے۔ حکیم صاحب کے ہاں روپ اور برن کے الفاظ نے مضمون کو بہت وسعت دیدی ہے۔ پہچاننا دل سے ہوتا ہے نہ ظاہری قد و قامت سے۔

نکال منہ سے نہ تو اپنے دیکھ فال خراب — یہ کیونکہ کرتی ہے فال خراب حال خراب

دوسرا مصرعہ "کہ چوں خال بد آورد حال بد" کا لفظی ترجمہ ہے۔

گر نصیب اچھے ہوں تو پھر خاک بھی ہو جائے زر
اور برے ہوں تو حلوا بھی ہوگا راکھ میں

سعدی کے اس شعر کی وجہ سے یہ مضمون نصیب ہوا ہے۔

بخت گر یاور شود دنداں بہ نداں لشکند — ور شود برگشتہ پالودہ، دنداں لشکند

مگر حکیم صاحب کو حلوے اور گارے کی مناسبت خوب سوجھی۔ ہاں شکل تو دونوں کی ایک ہے حلوا ہے کیا۔ روے کھانڈ اور گھی کا گارا ہے۔

سچ ہے منہ سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی
چھپ سکے کیونکر بھلا محفل کی بات

محاورے کی چاشنی دیکر حافظ کے مصرعے کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ع

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

برا نہ کہیئے جوانان رند مشرب کو   معاف رکھیئے انہیں سن عالم شباب ہے یہ

سعدی کا مشہور فقرہ ہے "در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی"۔
معاف رکھیئے۔ معاف دارید کا ترجمہ ہے۔ اب معاف کیجیئے بولتے ہیں۔

کون پہچانے ولی کو جز ولی   اہل دل جانے ہے اہل دل کی بات

فارسی کی مثل "ولی را ولی می شناسد" کا صاف ترجمہ ہے۔

بہر استقبال آتا ہے قبول حق۔ سنا   جب دعا جاتی ہے یہاں سے بلبلاتی خلق کی

شیخ سعدی سے مضمون لیا ہے۔

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن   اجابت از در حق بہر استقبال می آید

حکیم صاحب کا پہلا مصرعہ بہت کمزور ہے۔ دوسرا مصرعہ لاجواب ہے۔ اور میرے سے پوچھو تو شیخ سعدی کے پہلے مصرعے سے زیادہ زوردار ہے۔ راستے سے بھی کوئی بلبلاتا ہوا جاتا ہے تو گھر والے دیکھنے نکل آتے ہیں۔ اگر دعا بلبلاتی ہوئی خدا کی درگاہ میں جائے تو کیا تعجب ہے کہ قبولیت استقبال کے لیئے پردے سے باہر نکل آئے۔ شیخ کے ہاں یہ پہلو بالکل نہیں ہے۔ صرف بات یوں گو لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ اس شعر میں بھی ڈرا دیا۔

جو سخی پیشہ ہیں وہ بانٹ کے کھاتے ہیں سدا
ان کو ملتا ہے اگر نان جویں کا ٹکڑا

اس کا بھی شیخ سعدی کے شعر سے مضمون لیا ہے۔

نیم نانے گر خورد مرد خدا   بذل درویشاں کند نیمے دگر

رخ اس کا دیکھ کے زلفوں میں دل لگا کہنے
کہ جس کو کہتے ہیں "کالبدر فی الدجا" یہ ہے

نشاط نے اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے - فرماتے ہیں -

در زلف روئے ساقی و در شیشہ عکس مے کالبدر فی الدجیۃ و البرق فی الغمام

ایلچی کو کہیں سنا ہے زوال وہاں ضرر پہلے نامہ بر کو ہے

فارسی کی مشہور مثل ہے - "ایلچی را چہ زوال"

اطلاع و آگہی کے ایک ہی معنی ہیں، عیش، کہتے ہیں عربی زبان میں آگہی کو اطلاع

میں اس شعر کے معنی نہیں سمجھا - ہاں اس میں قاآنی کے ایک شعر کی سی الٹ پھیر ضرور ہے -

بلا بلفظ عرب امتحاں بود یعنے کہ بندہ را بہ بلا امتحاں کند داور

ہاتھ آئے گر غبار مجھے اسکی راہ کا سرمہ بناؤں قوت نور نگاہ کا

یہ مضمون فارسی کے اس شعر سے انہوں نے بھی لیا ہے - اور بہت سے شعرا نے بھی لیا ہے -

آرزو دارم کہ خاک آں قدم طوطیائے چشم سازم دم بدم

ہاں حکیم صاحب نے "قوت نور نگاہ" کے الفاظ سے ظاہر کر دیا ہے کہ یہ کسی حکیم کا شعر ہے کسی عطائی کا نہیں ہے -

---

ان کے اور شعرا اُردو کے ہم معنی اشعار -

بعض جگہ عیش کے خیالات اُردو کے دوسرے شاعروں سے جا لڑے ہیں، تھوڑے سے نقل کئے دیتا ہوں -

اے شمع صبح ہوتی ہے، روتی ہے کس لئے تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

اُستاد ذوق فرماتے ہیں -

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

"ذوق" کے ہاں "عمر طبیعی" نے بڑا ثقل پیدا کر دیا ہے - عیش کا شعر یقیناً بہت بڑھا

ہوا ہے، کیا نرم نرم الفاظ میں شمع کو سمجھایا ہے۔

اکڑنا سرو کا ہم دیکھ لیویں گے، اکڑنے دو
کبھی تو آئیگا گلشن میں وہ بھی خوش خرام آخر

اسی مضمون کو میر صاحب نے دوسرے پہلو سے باندھا ہے اور کمال کر دیا ہے۔

سرو و شمشاد چمن میں قد کشی کی ہے نزاع
تم ذرا داں چل کھڑے ہو، فیصلہ ہو جائے گا

خیر میر صاحب تو میر صاحب ہی ہیں، عیش کا شعر بھی برا نہیں۔

شغل کچھ چاہئے بہلانے کی خاطر دل کے
نہیں گر وصل کی امید چلو یاس تو ہے

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی (غالب)

ماری وہ دھول صبا نے کہ ہوا بس تڑکا
ہمسری رخ سے جو اس کے گل شاداب نے کی

مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہو جائے (ذوق)
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

حکیم صاحب کے ہاں پورا محاورہ نبدھا ہے۔ ذوق نے محاورے میں ذرا تصرف کیا ہی
مگر اچھا کیا ہے۔ عامیانہ محاورے سے بھلے آدمیوں کا محاورہ ہو گیا۔
کسی اور کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا ہے۔ کہتا ہے:-

یاں جو برگ گل خورشید کا کھڑکا ہو جائے
[illegible] رنگ پہ لگے تڑکا ہو جائے

بھولا کہتے نہیں اس کو یہ مثل ہے مشہور شام گو آئے اگر کوئی سحر کا نکلا

(غالب) اس کو بھولا نہ چاہئے کہنا صبح جو جائے اور آئے شام

عیش نے پورے محاورے کو لانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے شعر کی تکمیل بے ضرورت الفاظ بڑھائے بغیر نہ ہو سکی۔ "غالب" نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ پورا محاورہ نہیں آیا۔ نہ آئے شعر تو مزیدار ہو گیا۔

عظمت اللہ خاں مرحوم اس بارے میں "غالب" سے بھی کچھ آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے پورے محاورے کو قلابازی کھلادی، کہتے ہیں۔

جیسے ہے شوق جہاں میں تماشہ بینی کا
خبر وہ صبح کی لاتا ہے شام کا نکلا

اعتبار اس کے ہو کیا قول و قسم کا جو شخص ابھی دم بھر میں کہے "ہاں" ابھی دم بھر میں "نہیں"

(داغ) آپ کے لطف و عنایت کا بھروسہ کیا ہو
کہ گھڑی بھر میں اگر "ہے" تو گھڑی بھر میں "نہیں"

انصاف کی بات ہے کہ حکیم صاحب کا شعر بہت بڑھا ہوا ہے۔ دوسرا مصرعہ تو لاجواب ہے۔

کمال کی ہے یہاں تک کساد بازاری پھرے ہیں در بدر اب صاحب کمال خراب

(ذوق) یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

واقعی کمال کا شعر ہے۔

ہے زبان خلق نقارہ خدائے پاک کا منہ سے نکلی بات کب جاتی ہے خالی خلق کی

(ذوق) بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

ذوق کے ہاں پورا محاورہ آگیا ہے۔ حکیم صاحب نے تصرف کیا ہے۔ ذوق کے ہاں

رعایت لفظی نے شعر کو بدمزہ کر دیا ہے۔ عیش کا شعر اس کمزوری سے پاک ہے۔ ذوق کا شعر ایک رخا ہے
"بجا" کا پہلو نکلتا ہے۔ "بیجا" کا پہلو گم ہے۔ عیش کے ہاں دونوں پہلو موجود ہیں۔
دیں ہی گی گردن پہ چھری، یوں کہے خورشید فلک سامنے میرے۔ رخ یار کا ہمسر میں ہوں
تعقید اور بہت بری تعقید ہے۔ پڑھنے سے الجھن ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ذوق
کا شعر ملاحظہ ہو:۔

وہ کہے کون ہے قربان مری چتون پر (ذوق)
میں کہوں میں، تو کہے دیں ہی گی چھری گردن پر

کس خوبصورتی سے عاشق و معشوق کے سوال و جواب میں محاورہ برت گئے ہیں۔

آدمی کو شکل و صورت سے نہ کہیے آدمی آدمی جب آدمی ہیں آدمیت ہو تو ہو
اس شعر میں بھی بہت بری تعقید ہے۔ اسی مضمون میں ذوق کا شعر بھی سن لیجیے۔

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ (ذوق)
پست ہمت یہ نہ ہو اور پست قامت ہو تو ہو

کلام میں روانی حکیم صاحب کے کلام میں روانی غضب کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا امڈا چلا آتا ہے۔ بہت سے نمونے آپ پہلے دیکھ چکے، چند شعر اور لکھتا ہوں۔ ملاحظہ ہوں۔

عاشق جسے کہتے ہیں وہ پیدا نہیں ہوتا
اور ہوئے بھی بالفرض تو مجھ سا نہیں ہوتا

پہلے ایک کلیہ قائم کیا۔ اس کے بعد قطع محبت کے لئے استثناء قائم کیا۔ اور اس مستثنیٰ کے
مستثنیٰ خود بن گئے۔

میں ہوں گو سخت جاں لیکن بوقت ذبح اے ہمدم
یہ ممکن ہے کہ میں اور ہاں نہ وہ نازک دکھاؤں گا

الفاظ کیا جمائے ہیں موتی پرو دیے ہیں۔

پھاڑ دامن مرا تو خارِ بیاباں! اچھا
منع کرتا نہیں میں، شوق سے ہاں ہاں اچھا

لاجواب شعر ہے۔ کس مزے سے خارِ بیاباں کو دامن پھاڑنے کی اجازت دی ہے۔ الفاظ کی نشست ایسی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ کیوں نہ ہو استاد ہیں۔

دل مرا صرفِ تمنا ہو چکا — لو جی، لو بس یہ بھی جھگڑا ہو چکا
اک قدم وحشت میں اُٹھا تھا کہ بس — دیکھتے کیا ہیں کہ صحرا ہو چکا

دوسرا شعر کیا بلحاظ زباں اور کیا بلحاظ مضمون بے مثل ہے۔ ابھی قدم بھر نہ چلے تھے کہ صحرا ختم ہو گیا۔ خدا معلوم اگر دوسرا قدم رکھتے تو کون سے براعظم میں جا کر پڑتا۔

بس آب و دانہ کی یہ خوبیاں ہیں سب ورنہ — کہاں میں اور کہاں دام اور کہاں صیاد

رندؔ کا ایک شعر بالکل اس جیسا ہے۔

دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانہ نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

فرق اتنا ہے کہ انہوں نے سبب پہلے مصرعے میں ڈالا ہے اور رندؔ نے دوسرے مصرعے میں۔ حکیم صاحب کا شعر میری رائے میں رندؔ سے بڑھا ہوا ہے۔ رندؔ نے "کنجِ قفس" کے الفاظ سے مصیبت کو محدود کر دیا ہے۔ اِن کے شعر میں "یہ خوبیاں ہیں" ایسے وسیع الفاظ ہیں کہ سب مصیبتیں اس میں آ گئیں۔

کیوں چھپائیں کیا اجارا ہے کسی کا ہم نشیں
دیدیا ہے اپنا دل اس بت کو ہاں ہاں دیکھکر

"ہاں ہاں دیکھکر" کا مزا کچھ اہلِ زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

توبہ تو کی ہے ہاتھ پہ واعظ کے۔ ہاں مگر — ساقی پلا دے تو کچھ انکار بھی نہیں
کس مُنہ سے ہم کریں گے بھلا یار کا گلہ — ہم کو تو عیش، شکوۂ اغیار بھی نہیں

پہلے شعر میں "ہاں" اور "مگر" کے الفاظ کو دیکھیے۔ کس طرح دل کی اُلجھن کو رفتہ رفتہ

صاف کیا ہے۔ پہلے خیال آتا ہے کہ ہاں توبہ توڑ کی ہے نہ پینی چاہئے۔ پھر پلانے والے کا خیال آتا ہے۔ جھٹ شرط قائم کر کے راضی ہو جاتے ہیں۔

دوسرا شعر تو ایسا ہے کہ ضرب المثل ہونے کے قابل ہے۔

زاہد نہ گڑگڑا، تجھے مے دیں تو کیونکہ دیں
قسمت تری۔ اجازت پیر مغاں نہیں

سبحان اللہ۔ واما السائل فلا تنہر (اور جو مانگتا ہے اس کو نہ جھڑک) پر کس خوبی سے عمل کیا ہے بس یہ سمجھ لو۔ کہ کوئی فقیر خزانہ سرکاری پر جاتا ہے۔ گڑگڑا گڑگڑا کر پیسہ مانگتا ہے مہتمم کو رحم آتا ہے لیکن کیا کریں خزانے میں سے کوڑی نہیں دے سکتے۔ کہتے ہیں بھئی کیا کریں۔ ہم تو ہتھیلی کی ہتھیلی اٹھا کر دیدیتے۔ سرکار کا حکم نہیں ہے۔ جا تیری قسمت۔ شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں موتی جڑ دئے ہیں۔ ایک لفظ بیکار نہیں ہے اور کوئی لفظ ایسا نہیں جو اپنی جگہ سے ہل سکے۔ صرف یہ ایک شعر حکیم صاحب کی استادی کو منوانے کے لئے کافی ہے۔

سب عشق میں کہتے ترے کیا کیا نہیں ہم کو
کہتے ہیں۔ کہیں۔ اسکی بھی پروا نہیں ہم کو

مضمون معمولی ہے۔ مگر بندش نے اس مطلع کو مطلع خورشید بنا دیا ہے۔

اک ذرا پچ کے چلے۔ تیر قضا سے کہدو ہم کہے دیتے ہیں۔ تیر نگہ قاتل سے
وہ سنے یا نہ سنے تم تو بلا سے کہہ دو عیش جو ہو۔ سو ہو۔ اب حال دل زار اپنا

" وہ سنے یا نہ سنے تم تو بلا سے کہہ دو " ایسا مصرعہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی باتیں کر رہا ہے۔ اس مصرعے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اُٹھایا ہاتھ جو عشق بتاں سے تم نے تو پھر بسر کروگے بھلا عیش، عمر کیا کر کے

گویا دنیا میں بس یہی کام تھا اور اسی کام کے لئے آئے تھے۔ یہ نہ ہو تو جینا بے کار ہے۔

منع بکنے سے نہ کر ناصح نادان کو عیش،
اور گر کچھ نہیں۔ یہ ہی سہی بکواس تو ہے

ناصح کی بکواس کو سب روکتے ہیں۔ حکیم صاحب کہتے ہیں بکنے دو۔ تنہائی میں اس سے بھی

دل بہلتا ہے۔ اس کی ماننے والے تو ہم کب ہیں۔ چلو یونہی وقت کٹ جاتا ہے۔

حالِ دل ہم انہیں گر اپنا سنا دیویں گے ‌ ‌ ‌ ‌ تو یہ لکھ رکھو کہ انکو بھی رلا دیویں گے

دل کے دینے میں تو کچھ عذر نہیں بسم اللہ ‌ ‌ ‌ ‌ لیجئے۔ اس کی عوض پر ہمیں کیا دیویں گے

ہاں صاحب معاملہ کی بات ہے۔ معاملہ بغیر بدل کے پورا نہیں ہوتا۔ کچھ لو تو کچھ دو بھی۔

واعظ بیہودہ گو بکتا ہے بکنے دو اسے

وہ تو دیوانہ ہے تم اپنے رکھو کام سے کام

واعظ کی ایک رعایت اوپر کر چکے ہیں۔ یہ دوسری رعایت ہے۔ ارے میاں بکنے بھی دو دیوانہ ہے۔ تم کو جو کچھ کرنا ہے کئے جاؤ۔ سچ ہے۔

سنئے جو ہزار کچھ سنائے ‌ ‌ ‌ ‌ کیجئے وہی جو سمجھ میں آئے

جی ہاں۔ بس ان کی عاشقی دیوانہ پن کا کام نہیں ہے۔ اور سب کے کام دیوانہ پن کے ہیں۔ جو نصیحت کرے وہ بھی دیوانہ اور جو سنے وہ بھی دیوانہ۔ چلو چھٹی ہوئی۔ "اپنے کام سے کام لگا" کا محاورہ میر صاحب نے بھی باندھا ہے اور خوب باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بوسہ لیکر سرک گیا کل میں ‌ ‌ ‌ ‌ کچھ کہو۔ کام اپنے کام سے ہے

بخیہ گر اپنے گریبان کی تو خیر منا ‌ ‌ ‌ ‌ باز آ۔ دیکھ مرے چاک گریباں کو نہ چھیڑ

عیش انسان کو ہے حفظ مراتب لازم ‌ ‌ ‌ ‌ اس میں ہے ترک ادب یار کی داماں کو نہ چھیڑ

شعر میں نے لکھدئے۔ تعریف آپ کر لیجئے۔

جو رات شمع کو پروانہ جل بجھا چھو کر

تو شمع بولی۔ جلاتھا مجھے موا چھو کر

ذرا ردیف کو دیکھئے اور شعر کو دیکھئے شمع کی پاکدامانی کو دیکھئے۔ اور اس کی شرمیلی زبان کو دیکھئے۔ کوئی بیسوا ہوتی تو صاف کہہ دیتی کہ ہاتھ ڈال کر جلا تھا۔ بچاری شمع نے شرماتے شرماتے "چھونے" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ایسے شعر کوئی کہنے لگے تو چلو بس اُستاد ہے۔ اس کی استادی میں کون ٹنگ

لا سکتا ہے۔

سئے گا مرا زخم دل چارہ گر کیا — رہا ہی نہیں وہ سلانے کے قابل

سلانا خاص اہل زبان کا محاورہ ہے۔ عام طور سے سلوانا کہتے ہیں۔ اسی غزل کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔ حکیم صاحب نے بس غضب ہی کر دیا ہے۔

کہیں حضرت دل کا کیا حال تم سے — نہیں حال ان کا سُنانے کے قابل
غرض ساتھ اپنے اُنھوں نے ہمیں بھی — نہ رکھا کہیں آنے جانے کے قابل

یہ شعر وہ ہیں کہ پڑھیے اور مزے لیجئے۔ تعریف کی ضرورت نہیں۔ ایسے شعر تعریف سے مستغنی ہوتے ہیں۔ واہ حکیم جی واہ کیا کہنا ہے۔ خوب زبان پائی ہے۔ دل خوش ہو گیا۔

فارسی ترکیبیں

اِن کے کلام میں جو روانی ہے وہ آپ نے ملاحظہ کر لی۔ اب دو چار شعر ایسے بھی پیش کرتا ہوں جن میں فارسی ترکیبوں سے اُنھوں نے کلام میں زور پیدا کر دیا ہے۔

اک نظر اس کی عنایت کی ہو محشر میں تو عیش
رشکِ صد طاعتِ زہاد ہو عصیاں میرا

کس کی چھاتی ہے کہ جو سامنے اس کے ٹھیرے
ہدفِ ناوکِ مژگانِ ستمگر میں ہوں

خرمنِ تاب و تواں کے واسطے اے ہمنشیں
غیرتِ صد برق اس کا مسکرانا ہو گیا

اپنی آہیں برقِ آتش ریز ہیں — اور آنکھیں ابر طوفاں خیز ہیں
اے دل ان میٹھی نگاہوں پر نہ جا — یہ نگاہیں مصلحت آمیز ہیں

رقیب کرتے ہیں باتیں سب اسکی بزم میں عیش — بس ایک ہوتے ہیں واں سرمہ در گلو سے ہم

'ذوق' کی ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع ہے۔

جو کھل کر اُن کا جوڑا بال آئیں سر سے پاؤں تک
بلائیں آ کے لیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک

علیش کی بھی اسی زمین میں ایک غزل ہے۔ فرماتے ہیں۔

جو چل کر اپنی وہ سج دھج دکھائیں سر سے پاؤں تک
تو لے لے فتنۂ محشر بلائیں سر سے پاؤں تک

بسانِ کاغذ آتش زدہ۔ یہ تفتہ جاں وہ ہیں
جلے پر بھی بہار اور ہی دکھائیں سر سے پاؤں تک

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں غالب کا رنگ آگیا ہے۔

انگریزی الفاظ

کہیں کہیں انگریزی کے لفظ بھی باندھ گئے ہیں۔ کہتے ہیں۔

اس فرنگی بچہ سے میں نے جو بوسہ مانگا
ہاتھ پستول پہ رکھکر وہ لگا کہنے کہ ول

کیوں نہ ہو 'مجرم' کے شاگرد ہیں جنہوں نے "پستول فرانسیسی" چلایا ہے۔ ذرا ان شعروں کو دیکھئے، کیا مضمون ہے، کیا زبان ہے، اور کیا قافیہ ہے۔

کچھ اس روش سے ہوا ہے یہاں جلوس چمن | کہ شاخ گل بھی ادب سے ہے پائے بوس چمن
شکست دینے کو فوج خزاں کو گلشن میں | ہنس یہ غنچۂ گل ہے یہ کارتوس چمن

نئے نئے الفاظ کے استعمال کا شوق

سچ فرمائیے گا، غنچۂ گل کی تشبیہ کارتوس سے کیسی خوبصورت دی ہے۔ انشاء اللہ خاں کا رنگ ہے۔ بات یہ ہے کہ حکیم صاحب کو نئے الفاظ استعمال کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ملاحظہ ہو۔

اُچھل خزانے پہ اپنے نہ مثل فوّارہ | کرے گا دیکھ یہ تیرا تجھے اُچھال خراب

حکیم صاحب کے دھیان میں اُچھال کا قافیہ اس لیے آیا کہ دلّی میں عورتیں جی متلانے کو اچھال کہتی ہیں اور حکیموں کے کانوں میں یہ لفظ اکثر پڑتا رہتا ہے۔

چشم گلگوں ہیں کہ اینڈے ہیں یہ مستانے دو
یا بھرے ہیں مے گلرنگ کے پیمانے دو
اینڈتے ہوئے مستانوں سے شاید کسی نے چشم یار کو تشبیہ دی ہو تو دی ہو، مجھے تو بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔

لگا کے اس بت غافل نے سرمہ آنکھوں میں | چڑھائی اور بھی تیغ نگاہ سان یہ ہے
میں بوجھ بوجھ کا اے دعیش اسکی قائل ہوں | طبیعت آئی زلیخا کی کس جوان یہ ہے

ٹھیک ہے آدمی کو سمجھ بوجھ کر عاشق ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ میاں مجنوں کی طرح کالی کلوٹی لیلیٰ پر لوٹ ہو جائے۔

غزل کی غزل ملاحظہ فرمائیے کیا بے ڈھب قافیے برتے ہیں۔

باغ میں کرتی ہے عشق ذکرا ڈہ فاختہ | ہر قطع ماسوائے اللہ روزمرّہ فاختہ
ہے اسی کو کو پہ تجھ کو اپنے غرّہ فاختہ | بلبل شیدا کے آگے جا نہ ٹرّا فاختہ
ہمسری کا اس سے گر دعویٰ کیا تو فی تو بس | تا قیامت تجھ پہ ہوے گا تبرّا فاختہ

دیکھکر بیمار غم کو تیرے یہ بولے مسیح
فاتحہ پڑھ لو کہ ڈھب ہے اسکی بیماری کی طرز

حکیم صاحب نے بڑا ہی کڈھب لفظ شعر میں ٹھونسا ہے۔ خود کسی مریض کے لئے کسی موقعے پر استعمال کیا ہوگا، گھر پہ آکر نظم کر لیا۔ خود مسیح بن گئے، چلو شعر ہو گیا۔ ان کا ایک قصیدہ ہے۔

نسیم صبح نے دی آج وہ خوشی کی خبر | کہ غنچہ ہائے دل بستہ کھل گئے یکسر
رہا نہ نام کو عالم میں انقباض کا نام | یہ اب کے سال کھلا انبساط کا دفتر

آگے چل کر ایک سراپا دیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔

وہ لب کہ لعل جسے دیکھ ہونٹ چاٹے ہے | وہ لب کہ سامنے یاقوت جس کے ہے پتھر
وہ لب کہ جسکی ثنا خواں ہیں برگ گل سارے | وہ لب کہ حضرت عیسیٰ ہوں دیکھ انہیں مضطر

قیامت ان میں یہ اعجاز ہے کہ جی اُٹھیں   سبھی جہان کے مردے جو کردیں چھو منتر

چھو منتر خاص مداریوں کا محاورہ ہے اور بڑے مزے سے بندھا ہے۔

ایک دوسرا قصیدہ ہے۔

لکھے ہے باخط گلزار اشتہار اب کے   زمیں کے صفحہ پہ یوں واقعہ نگار بکے

نسیم لائی ہے گلشن میں وہ بہار اب کے   کہ حکم گل کا رکھے ہے ہر ایک خار اب کے

ذرا آگے بڑھ کر فرماتے ہیں۔

میں کیا بیان کروں مستی بہار کا رنگ   غرض صغار سے ہیں مست تا کبار اب کے

قیاس اس پہ کیا چاہئے کہ صوفی کے   یہاں تلک ہے حواسوں میں انتشار اب کے

کہ ایک جرعۂ مے کیلئے سر بازار   وہ ساتھ رندوں کے کرتا ہے تو تکار اب کے

تو تکار اور رتو تو میں میں ٹھیٹھ اُردو کے محاورے ہیں۔ بولے بہت جاتے ہیں لکھنے میں کم آتے ہیں حکیم صاحب کو قافیہ ملا۔ اب کہاں جانے دیدیتے تھے۔ لکھ گئے اور ایسا کھ گئے کہ واہ واہ۔ صوفی کا رنگ دکھانے کے بعد زاہد کہاں بچنے والے تھے ان کو بھی دھر گھسیٹا۔

نہ ہوگا پاس اگر کچھ تو جام مے کے لئے
رکھے گا دیکھنا زاہد گرو ازار اب کے

جورو کی ازار گروی رکھنے کا محاورہ ہے۔ انہوں نے زاہد کی ازار گروی کرادی۔ زاہد کی تہمد اگر گروی کراتے تو اچھا تھا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ آسمان اب کسی کو اذیت نہیں دیتا۔ ترے ڈر سے اس کی گردش کو بھی سکون ہو گیا ہے۔ مگر مجھ سے اسے کچھ خاص دشمنی ہے۔

پر اک کھٹر پنچ ہے مجھ سے کہ اس مہینے میں   یہی کہے ہے کہ تو خرچ کر ادھار بکے

سو داد خواہ ہوں میں تجھ سے اسکی کانوں کو   مروڑ دے تو ذرا شاہ مدار اب کے

واقعی بڑی خوبی سے تنخواہ نہ ملنے کی شکایت کی ہے۔ کھٹر پنچ کا لفظ شاید آپ کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہ دیکھیں گے۔

اپنے ایک قصیدے میں حکیم صاحب ایک ایسا لفظ استعمال کر گئے ہیں کہ شاید دھلی والوں کے

سوا کسی اور نے سنا بھی نہ ہوگا۔ قصیدہ ہے۔

جہاں میں دیکھو تو اللہ رے فیض ابر بہار — کہ دھو دیا ہے زمیں تو زمیں دلوں کا نجار

خواص باد بہاری کا میں اگر لکھوں — تو ہوے صفحۂ قرطاس غیرت گلزار

جہاں سے دور ہوئی یہاں تلک پریشانی — کہ گھس لگانے کو ملتی نہیں جو ڈھونڈو ہزار

گھس لگانا اب دلی والے نہیں بولتے۔ حیدرآباد میں یہ محاورہ اب تک رائج ہے۔

آگے ساقی کو پکارتے ہیں۔

پلا دے جلد وہ ساقی مجھے مئے گلنار — کہ جس کے پینے سے گلگون طبع ہو رہوار

شتاب دے مئے گلرنگ بھر کے ساغر میں — کہ سمت قبلہ سے اُٹھا ہے ابر دھوندو نکار

دھوندو نکار کے لفظ کو دیکھئے اور ابر کی اضافت کو دیکھئے۔ دھوندو نکار ایسے ابر کو کہتے ہیں جو گرجے بھی بہت اور برسے بھی بہت۔ میری نظر سے صرف ایک شعر اور گزرا ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ خدا معلوم بچارے کس میر شکار کی ہجو تھی کہ دلی کے بچے بچے کی زبان پر روان ہو گئی۔ اِدھر گہرا ابر آیا اور اُدھر بچوں نے غل مچایا۔

کڑکے گی کڑک بجلی — برسیں گے دھوندو نکار

بھیں گے گو کے ٹوکرے — چاٹیں گے میر شکار

دھوندو نکار کا لفظ یا وہاں سنا تھا یا اب حکیم صاحب کے قصیدے میں دیکھا۔

حال دریافت ہوا عشق کا غم کھائے کے بعد — قدر معلوم ہوئی دل کی تو دل جائے کے بعد

ایک ہی تیر میں شاید ہوا کام عاشق — کیونکہ آواز نہیں آئی پھر اک آئے کے بعد

دوسرے شعر میں "آئے" کا لفظ حکیم صاحب نے غضب کا استعمال کیا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو "ہائے" لکھتا۔ کیونکہ وہ بھی قافیہ تھا۔ انہوں نے بجائے "ہائے" کے "آئے" لکھا ہے۔ حکیم تھے اس لئے ہائے اور آئے کا فرق جانتے تھے۔ جب کسی کو سخت تکلیف ہوتی ہے یا ایسا کاری زخم لگتا ہے کہ پورا سانس پیٹ میں نہیں سماتا تو "ہائے" کا لفظ اس سے ادا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "ہ" کے ادا کرنے کے لئے پورا منہ کھولنا پڑتا ہے۔ اور اس کے لئے سانس کی ضرورت ہے۔ ایسے موقعے پر

بیمار یا زخمی صرف اک دلدوز "آئے" کرتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہائے ہائے تو وہ بیمار کرتے ہیں جنکو تیمار داروں کو دن میں تکلیف دینی اور رات کو جگانا منظور ہوتا ہے۔ یقین جانیئے کہ اردو لٹریچر میں صرف حکیم صاحب ہی نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اور اس طرح استعمال کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی فرماتے ہیں کہ شاید ایک ہی تیر میں عاشق کا کام تمام ہو گیا۔ کیونکہ صرف ایک "آئے" کی آواز آنے کے بعد پھر کوئی آواز نہیں آئی۔ اگر تیر اچٹتا ہوا لگتا تو ہائے ہائے سے اس نے آسمان سر پر اُٹھا لیا ہوتا۔

اسی شعر کے متعلق ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ میں چند دوستوں میں بیٹھا اس "آئے" کی تعریف کر رہا تھا۔ سب دوستوں نے بھی تعریف کی اور کہا کہ واقعی "ہائے" کے لفظ سے شعر میں وہ خوبی نہ رہتی جو اب پیدا ہو گئی ہے۔ میرے ایک دوست سنتے رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔ آخر کہنے لگے "دیکھو بھئی اگر "آئے" کی جگہ "ہائے" ہوتا تو کیا ہرج تھا۔ آخر وہ بھی تو قافیہ ہے" اگر آپ کی بھی یہی رائے ہے تو میں نے خواہ مخواہ آدھا صفحہ لکھ کر آپ کا اور اپنا دونوں کا وقت ضائع کیا۔ میری ہی غلطی تھی حکیم صاحب کا دیوان خود ان کا صحیح کیا ہوا ہے۔ نہایت صاف خط ہے اور "آئے" کے الف پر بڑا موٹا مدّ دیا ہوا ہے۔ اگر "ہائے" اسی طرح مدّ سے لکھتے ہیں تو آپ کی رائے صحیح اور میری غلط۔

جو ہیں دُھر سے گرفتار محبت　　اُٹھاتے ہیں وہی بار محبت

'دُھر' روز ازل کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ دُھر محاورے میں پرلے کنارے کو کہتے ہیں۔

مجھ سے بولے، کل نشہ میں خوب بہکا رہے ہیں آپ
یہ نہ سمجھے اور ہی وہ بے حیا تھی میں نہ تھا

ایک قصہ مشہور ہے کہ آصف الدولہ ہاتھی پر سوار جا رہے تھے۔ ایک شرابی نشے میں چور سڑک کے کنارے لیٹے تھے۔ جب سواری پاس سے گزری تو آپ نے آواز لگائی "ابے او ہاتھی والے۔ ہاتھی بیچتا ہے"۔ نواب نے کوتوال کو اشارہ کیا، وہ شرابی صاحب کو اٹھا کر لے گئے۔ چاوڑی پر لیجا کر بہت کچھ مرمت کی۔ نشہ ہرن ہو گیا۔ جب ذرا درست ہوئے تو دربار میں لے جا کر پیش کیا۔ آصف الدولہ نے مسکرا کر پوچھا "کہو بھئی ہاتھی خریدتے ہو"! شرابی نے کہا "سرکار۔ بھلا میں اور ہاتھی خریدوں۔ کہنے

سوا کسی اور نے سنا بھی نہ ہوگا۔ قصیدہ ہے۔

جہاں میں دیکھو تو اللہ رے فیض ابر بہار | کہ دھو دیا ہے زمیں تو زمیں دلوں کا نجار
خواص باد بہاری کا میں اگر لکھوں :: | تو ہووے صفحۂ قرطاس غیرت گلزار
جہاں سے دور ہوئی یہاں تلک پریشانی | کہ گھس لگانے کو ملتی نہیں جو ڈھونڈو ہزار

گھس لگانا اب دلی والے نہیں بولتے۔ حیدر آباد میں یہ محاورہ اب تک رائج ہے۔
آگے ساقی کو پکارتے ہیں۔

پلادے جلد وہ ساقی مجھے مئے گلنار | کہ جس کے پینے سے گلگون طبع ہو رہوار
شتاب دے مئے گلرنگ بھر کے ساغر میں | کہ سمت قبلہ سے اُٹھا ہی ابر دھوندو نکار

دھوندو نکار کے لفظ کو دیکھئے اور ابر کی اضافت کو دیکھئے۔ دھوندو نکار ایسے ابر کو کہتے ہیں جو گرجے بھی بہت اور برسے بھی بہت۔ میری نظر سے صرف ایک شعر اور گزرا ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ خدا معلوم بچارے کس میر شکار کی ہجو تھی کہ دلی کے بچے بچے کی زبان پر روان ہو گئی۔ ادہر گہرا ابر آیا اور اُدہر بچوں نے غل مچایا۔

کڑکے گی کڑک بجلی | برسیں گے دھوندو نکار
بھیں گے گو کے ٹوکرے | جائیں گے میر شکار

دھوندو نکار کا لفظ یا وہاں سُنا تھا یا اب حکیم صاحب کے قصیدے میں دیکھا۔

حال دریافت ہوا عشق کا غم کھائے کے بعد | قدر معلوم ہوئی دل کی تو دل جائے کے بعد
ایک ہی تیر میں شاید ہوا کام عاشق | کیونکہ آواز نہیں آئی پھر اک آئے کے بعد

دوسرے شعر میں "آئے" کا لفظ حکیم صاحب نے غضب کا استعمال کیا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو "ہائے" لکھتا۔ کیونکہ وہ بھی قافیہ تھا۔ انہوں نے بجائے "ہائے" کے "آئے" لکھا ہے۔ حکیم تھے اس لئے ہائے اور آئے کا فرق جانتے تھے۔ جب کسی کو سخت تکلیف ہوتی ہے یا ایسا کاری زخم لگتا ہے کہ پورا سانس پیٹ میں نہیں سماتا تو "ہائے" کا لفظ اس سے ادا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "ہ" کے ادا کرنے کے لئے پورا دمہ کھینچنا پڑتا ہے۔ اور اس کے لئے سانس کی ضرورت ہے۔ ایسے موقعے پر

بیمار یا زخمی صرف اک دلدوز "آئے" کرتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہائے ہائے تو وہ بیمار کرتے ہیں جنہیں تیمار داروں کو دن میں تکلیف دینی اور رات کو جگانا منظور ہوتا ہے۔ یقین جانیئے کہ اُردو لٹریچر میں صرف حکیم صاحب ہی نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اور اس طرح استعمال کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ شاید ایک ہی تیر میں عاشق کا کام تمام ہو گیا۔ کیونکہ صرف ایک "آئے" کی آواز آنے کے بعد پھر کوئی آواز نہیں آئی۔ اگر تیر اچٹتا ہوا لگتا تو ہائے ہائے سے اس نے آسمان سر پر اُٹھا لیا ہوتا۔

اسی شعر کے متعلق ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ میں چند دوستوں میں بیٹھا اس "آئے" کی تعریف کر رہا تھا۔ سب دوستوں نے بھی تعریف کی اور کہا کہ واقعی "ہائے" کے لفظ سے شعر میں وہ خوبی نہ رہتی جو اب پیدا ہو گئی ہے۔ میرے ایک دوست سنتے رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔ آخر کہنے لگے "کیوں بھئی اگر "آئے" کی جگہ "ہائے" ہوتا تو کیا ہرج تھا۔ آخر وہ بھی تو قافیہ ہے" اگر آپ کی بھی یہی رائے ہے تو میں نے خواہ مخواہ آدھا صفحہ لکھ کر آپ کا اور اپنا دونوں کا وقت ضائع کیا۔ میری ہی غلطی ہو گی۔ حکیم صاحب کا دیوان خود ان کا صحیح کیا ہوا ہے۔ نہایت صاف خط ہے اور "آئے" کے الف پر بڑا موٹا مدّ دیا ہوا ہے۔ اگر "ہائے" اسی طرح مدّ سے لکھتے ہیں تو آپ کی رائے صحیح اور میری غلط۔

جو ہیں دُھر سے گرفتار محبت ‏ ‏ ‏ اُٹھاتے ہیں وہی بار محبت

"دُھر" روزِ ازل کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ دُھر محاورے میں پرلے کنارے کو کہتے ہیں۔

مجھ سے بولے، کل نشہ میں خوب بہکا رہے ہیں آپ
یہ نہ سمجھے اور رہی وہ بے حیا تھی میں نہ تھا

ایک قصہ مشہور ہے کہ آصف الدّولہ ہاتھی پر سوار جا رہے تھے۔ ایک شرابی نشے میں چور سڑک کے کنارے لیٹے تھے۔ جب سواری پاس سے گزری تو آپ نے آواز لگائی "ابے او ہاتھی والے۔ ہاتھی بیچتا ہے"۔ نواب نے کوتوال کو اشارہ کیا، وہ شرابی صاحب کو اٹھا کر لے گئے۔ چاوڑی پر لیجا کر بہت کچھ مرمت کی۔ نشہ ہرن ہو گیا۔ جب ذرا درست ہوئے تو دربار میں لے جا کر پیش کیا۔ آصف الدولہ نے مسکرا کر پوچھا "کہو بھئی ہاتھی خریدتے ہو"! شرابی نے کہا "سرکار۔ بھلا میں اور ہاتھی خریدوں۔ کہاں

کو تو کوڑی نہیں۔ ہاتھی خرید کر کس کے گھر باندھونگا۔ چوہا بل سماتے نہیں اور دم سے باندھتے چھاج۔ نواب نے کہا "ارے بھئی تھوڑی دیر تو ہوئی جو تم نے ہاتھی کی قیمت پوچھی تھی" شرابی نے کہا حضور وہ خریدنے والا دوسرا تھا۔ وہ چلا گیا۔ میں رہ گیا" آصف الدولہ نے خوش ہو کر ہاتھی دے ڈالا۔ یہ جاتے جاتے بیچ کر شراب پی گئے۔ اس شعر کے لکھتے وقت حکیم صاحب کے پیش نظر یہ قصہ ضرور ہوگا۔ اسی زمانہ کی بات تھی، ایسی باتوں کے چرچے بہت ہو جاتے ہیں۔ شاعروں کو مضمون ملجاتا ہے۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصے نہ ہوتے تو اردو شاعری آدھی رہ جاتی۔

کسکو ملنے کا اس کے چاؤ نہیں — کس کو اس شوخ سے لگاؤ نہیں

دل تھا اپنا دیا جسے چاہا — کچھ کسی کا ہمیں دباؤ نہیں

اُس کے رُخ کی وہ آب و تاب ہے عیش — مہ و خورشید جس کے پاؤ نہیں

"پاؤ" کا خوب قافیہ نکالا ہے۔ اس زمانہ میں "دو نان پاؤ" نکل آتا تو کیا تعجب ہے کہ حکیم صاحب معشوق کے گالوں سے تشبیہ دے جاتے۔ ان کو تو نئے نئے قافیوں کی تلاش ہی رہتی تھی۔

سخت مضامین | حکیم صاحب کے دیوان میں بعض شعر ایسے ہیں کہ کسی فلسفہ یا حکمت کی کتاب میں شریک کر دئے جائیں تو بہتر ہے۔ شعراء ان حجتوں کی تاب نہیں لا سکتے۔

دل کی بیتابی ہے بالذات اور اسکی بالغرض

باعث جنبش سیماب ہے۔ سیماب میں آب

ہو گئے اس سے قوی اور متغیر اجزا

ساتھ ان کے جو ملا کر یہ کھرل کی مکھی

یاد مژگاں کی یہاں کیا ہے۔ کسی نے گویا

نیشتر ڈال کے اندر ہیں گھنگولے دل کے

نشتر گھنگولنا جراحوں کی اصطلاح میں زخم میں گہرا نشتر لگا کر ادھر اُدھر کے خراب گوشت

کے کاٹنے کو کہتے ہیں۔

جبر و قدر کا مسئلہ اس طرح حل کرتے ہیں۔

رباعی

انسان ہے اختیار میں بھی اپنے مجبور　　اس رمز کو سمجھیں وہ جو ہیں اہل شعور
بالعرض ہے اختیار و جبر اس کو حاصل　　بالذات نہیں ہے اس کو کچھ بھی مقدور

مضمون کے ساتھ زبان

حکیم صاحب کے دیوان میں زبان کے ساتھ مضمون کی بھی کمی نہیں ہے، ایسے سینکڑوں شعر اوپر لکھ آیا ہوں۔ چند شعر اور لکھ دیتا ہوں۔ مضمون بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ پڑھتے پڑھتے گھبرا گئے ہونگے۔ میں لکھتے لکھتے تھک گیا ہوں اب قصے کا سمیٹ دینا ہی بہتر ہے۔

پوچھا جب منصور سے تو نے انا الحق کیوں کہا
یہ کہا اس نے کہ وہ شان خدا تھی میں نہ تھا

انا الحق کی اس شان کی وجہ آپ نے بہت کم دیکھی ہوگی "شان خدا" نے شعر میں جان ڈال دی ہے اور معنی میں عجب وسعت پیدا کر دی ہے۔ اسی غزل میں ایک اور بڑا چبھتا ہوا شعر ہے۔

میں نے کیا افشا کیا راز اسکا سوچ اے ہمنشیں
باعث افشاء راز اسکی حیا تھی میں نہ تھا

بے حیائی تیرا ہی آسرا۔ فرماتے ہیں۔ میں نے ان کو کیا رسوا کیا۔ میری طرح وہ بھی بے حیا ہو جاتے تو کوئی خیال بھی نہ کرتا۔ ان کی شرمیلی شکل نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ سچ ہے "بس نے کی شرم اُسکے پھوٹے کرم"۔

اسی مضمون کو ایک دوسرے شعر میں بھی باندھا ہے۔

تیری چاہت کو نہ ملنے سے سبھو نے جانا　　تم اگر ملتے تو یہ راز نہ افشا ہوتا

ادب آداب کے مضمون سنئے۔

آداب میکدہ سے نہیں بہرہ آپ کو　　رستہ لو، جاؤ شیخ جی تم، خانقاہ کا

فتوئے پیرِ مغاں ہے کہ ہے مے اسپہ حرام
آتے جس شخص کو مے پینے کے آداب نہیں

ا نصیحتیں ملاحظہ فرمائیے ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔

یہ عیش جائے غور ہے شکوہ ہو اس کا کیا
انسانیت سے اپنی جو انساں نکل گیا

دعیش، سب اپنی برائی ہے۔ نہیں کوئی بُرا
سب بھلے ہیں یہ اگر آپ ہے انساں اچھا

شکوہ غیروں کا ہے اے عیش، عبث کیا کہیے
اِن سے بدتر ہیں اگر دیکھیے احباب کے ڈھنگ

مدار دوستی و دشمنی کا اللہ نے
رکھا جہاں میں انسان کی زباں پر ہے

سچ فرماتے ہیں یہ دو انگل کی للو دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن کر دیتی ہے۔

توڑ سکتا ہے تو بس نفس کو دے اپنے شکست   اور بناتا ہے تو قصرِ دلِ احباب بنا

مشاعرے کی غزل ہے۔ ذوق کے شعر بھی اس زمین میں ہیں۔ وہ اسی قافیہ کو اسطرح باندھتے ہیں۔

سرمۂ چشم عزیزاں نہ بنا میں اے چرخ!   کیا بنا خاک غبارِ دلِ احباب بنا

مقابلہ کر لیجئے۔ حکیم صاحب کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ دو نصیحتیں ایک شعر میں جمع کر دی ہیں اور
[illegible] سی ہیں کہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔
[illegible] عاشقانہ رنگ ملاحظہ ہو۔

ہے رعیش ہاتنک ظرفی معشوق سے یہ کہنا　ہم جان فدا کرتے۔ گر وعدہ وفا ہوتا

اچھا شعر ہے۔ عاشق کو جان فدا کرنیکے لئے کسی سبب کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایرے غیرے نکا
کام ہے کہ بیمار پڑے بغیر نہیں مرتے۔

تھی وصیت سب سے اس ناکام الفت کی یہی
میں کبھی مرجاؤں لیکن کیجیو خالی میں پھول

ذیقعدہ کے مہینے کو دلی میں خالی کا مہینہ کہتے ہیں۔ جن کا آغوش تمنا ہمیشہ خالی رہا۔ ان کے
پھول کچھ خالی ہی میں ہونے مناسب ہیں۔

کہا مجنوں نے مجھکو دیکھکر اے رعیش ہاحیرت سے
خداوندجہاں۔ آشفتہ جاں ایسے بھی ہوتے ہیں

دیکھنا کس خوبی سے اپنے کو مجنوں سے بڑھا دیا ہے۔ دوسرا مصرعہ بندش کا بہترین نمونہ ہے۔

پابندی ہے اے رعیش ہا بُری سب کے لئے پر
سچ یوں ہے کہ پابندی آزاد غضب ہے

کتنا سچا مضمون کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے کہ سبحان اللہ۔ عورتیں گھر میں بیٹھنے سے نہیں
گھبراتیں۔ کسی سیلانی جیوڑ کو پردہ بٹھادو تو مزا آئے۔

پوچھے وہ حال دل غمزدگاں کا کیونکر　لب ہلانے کی بھی فرصت جسے انداز نہ دے
مرغ دل چپکے سے کیا تیر نگہ نے مارا　خوبی تیر یہی ہے کہ وہ آواز نہ دے

بھلا اب ہندوستان والے اس دوسرے شعر کی خوبی کیا سمجھیں گے جنہوں نے تیر چلانا تو کیا
تیر دیکھا بھی نہ ہوگا۔ توپ چلتی دیکھی ہے اُکی یہ تعریف ہے کہ کان پھٹ جائیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ کھلتا نہیں میرا احوال　یہ نہیں جانتے یار دل کو خبر سب کچھ ہے

ایک تقدیر کے ہاتھوں سے تو لاچار ہے یہ   ورنہ کرنے کو تو کرتا یہ بشر سب کچھ ہے

شیخ تو اپنے گریباں میں مُنہ ڈال کے دیکھ
تیری تسبیح کو ہے رشتۂ زنّار سے فیض

سچ ہے۔ تسبیح کیا ہے گرہ دار زنّار ہے۔

ہائے کیا شعر کہہ گئے ہیں۔

سینہ میں اک کھٹک سی ہے بس اور   ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے دل؛

کھٹک کا لفظ ایسا آیا ہے کہ کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ شاعری کی لحاظ سے تو یہ شعر لاجواب ہے ہاں اس سے حکیم صاحب کی حکمت پر حرف آتا ہے اگر اتنا بھی نہیں جانتے کہ دل کیا ہے تو خاک حکمت کرتے ہوں گے۔ اسی رنگ کا ایک شعر شیفتہ نے بھی کہا ہے۔ اور واقعی خوب کہا ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے "شیفتہ"   جو آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

گردش ہے اسکی چشم کو مستی میں، یا کہیں
نرگس کا پھول تیر رہا ہے شراب میں

سبحان اللہ۔ کس غضب کی تشبیہ دی ہے۔ شراب کے نشہ میں یار کی آنکھ کے کونے گلابی ہو گئے ہیں۔ نشہ کی وجہ سے آنکھ قائم نہیں ہوتی۔ کچھ آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ "نرگس کا پھول تیر رہا ہے شراب میں"۔ آنکھ کو نرگس سے سب ہی تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ مگر ایسی تشبیہ نہ کبھی دیکھی نہ سُنی۔ کوئی معشوق نشے میں ہو اس وقت اس کی آنکھیں دیکھئے جب اس شعر کا مزا آئیگا۔

بخشش کی امید | حکیم صاحب کو بڈھے ہو کر مرنے کا بڑا فکر ہو گیا تھا۔ اپنی بخشش کے لئے نئی نئی حجتیں سوچتے اور دل کو تسکین دیتے تھے۔ جوانی میں مر جاتے تو یہ شعر ان کے دیوان میں نہ ہوتے بات یہ ہے کہ بڈھے مرنے سے بہت ڈرتے ہیں۔

اس قدر راہ عدم بھی ہے اسے غش کر دو   کیے بند آنکھ چلے اور چلے جاتے ہیں

نہ بھول زہد پہ، لذت ہے بخشش حق کی   وہ بے نصیب ہے جب تک گنہگار نہ ہو

اس کے ہیں تو یہ معنی سمجھا ہوں کہ زہد پر اگر تیری بخشش ہوئی تو کیا کمال ہوا۔ جو کیا تھا اس کا پھل پایا۔ ارے میاں نصیبہ ور تو وہ ہیں جو گنہگار تھے اور پھر بخشش ہوئی۔ بخشش تو گنہگاروں ہی کی ہوتی ہے بھلا زاہدوں کی بخشش بھی کوئی بخشش ہے۔ یہ تو دادلے کا بدلہ ہے۔

بھلا وعیش، کیا خوف محشر ہے تم کو   وہ بخشندہ ہے اور گنہگار ہم ہیں

وہی اوپر والا مضمون ہے۔ صرف زاہد پر طعن نہیں ہے۔ عمر خیام نے اسی مضمون کو کس عمدگی سے ادا کیا ہے کہ سبحان اللہ فرماتے ہیں۔

یارب تو کریمی و کریمی کرم است   عاصی زچہ رہ بیرون نہ باغ ارم است

باطاعتم ار بنجشی آن نیست کرم ؛   بامعصیتم ار بنجشی کرم است

قدسی کا بھی ایک شعر اس مضمون میں لاجواب ہے۔

قدسی ندانم چوں شود سودائے بازار جزا

او نقد آمرزش بکف من جنس عصیاں در بغل

پرانے زمانے کے مولوی اس شعر کے یوں معنی کرتے ہیں۔ خدا معلوم حشر میں کیسی گزرتی ہے ہمارے پاس کھوٹی جنس ہے اور اس کے پاس کھرے روپے۔ یقیناً منہ کالا ہوگا۔ دھکے دے کر نکلوائے جائیں گے۔

آج کل کے زمانے کے پروفیسر اس شعر کے دوسرے معنی لیتے ہیں۔ وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ وہ جنس عصیاں خریدنے کو نقد آمرزش لئے بیٹھا ہے۔ ہم گئے۔ اپنی پوٹلی نکال اسکو دی۔ نقد دام وصول کر گھر کو آ گئے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ یہ بازار روز جزا جس کا لوگوں نے اتنا غل مچا رکھا تھا ہے کیا بلا۔

قدسی کے شعر کے جو معنی ہیں بس وہی معنی حکیم صاحب کے شعر کے ہیں "وہ بخشندہ ہے اور گنہگار ہم ہیں" کا مطلب یہی ہے کہ "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کا نقد سودا ہو جائیگا۔

سہرا | جواں بخت کا سہرا غالب نے بھی کہا تھا۔ ذوق نے بھی کہا تھا۔ بھلا حکیم صاحب کیوں پیچھے

رہتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سہرا کہنے کا دستور اس زمانے میں عام تھا۔ کچھ مرزا غالب کی ایجاد نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر اس زمانے میں سمجھا جاتا ہے۔

آج تک چشم فلک نے بھی تو دیکھا ہی نہیں — اس جوان بخت کے سہرے کے مقابل سہرا

ایسے نوشہ کیلئے ایسا ہی سہرا تھا ضرور — بندھتے ہی کیا رخ نوشہ پہ گیا کھل سہرا

نیا مضمون | حکیم صاحب کے مکان میں باغیچہ تھا۔ کوئی مالی بھی ضرور رہو گا۔ اسی وجہ سے شاید تھوڑے بہت فن باغبانی سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ ورنہ یہ شعر ان کے قلم سے نکلنا ممکن نہ تھا۔

اِن دنوں نالۂ دل کو ہے اثر سے پیوند — بے ثمر نخل ہوا نخل ثمر سے پیوند

یہ صرف جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ بے ثمر درخت کی شاخ ثمر دار درخت سے پیوند نہیں کھاتی اتنا سمجھنے کے بعد شعر بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ یا الٰہی آجکل یہ ناممکن بات کیسے ہو رہی ہے کہ نالہ جیسی بے ثمر شئے اثر جیسی ثمر دار چیز سے پیوند کھا رہی ہے۔

متروک الفاظ | ان کے دیوان میں بہت کم الفاظ ایسے آئے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو کو مانجھنے میں کتنی کوشش کی ہے۔ نمونہ کی طور پر چند شعر لکھتا ہوں۔

جھنتے تو نہ پڑ جاتے کچھ شان میں اے ظالم — کیا حال ہے کہہ تیرا۔ اتنا تو کہا ہوتا

شعر میں بُری تعقید ہے اور جھنتے پڑنے کا محاورہ بھی اب نہیں بولا جاتا۔ پہلے عام طور پر خرابی کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اب صرف کپڑوں میں جھنتے پڑتے ہیں۔ دھوبیوں کی اصطلاح رہ گیا ہے۔

بہکانے سے غیروں کے کیا کیجئے اب اس کا — ہر بات میں وہ مجھ سے تکرار اٹھاتے ہیں

اب تکرار کرنا بولتے ہیں۔

چپ رہو بدزبانیاں نکرو — ایسی باتیں دیوانیاں نکرو

خدا معلوم یہ جمع کا استعمال کیوں ترک کر دیا گیا ہے۔ اس سے تو زبان ایسی میٹھی لگتی تھی کہ کیا کہا جائے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے۔ پہلے کہتے تھے "ایسی باتیں دیوانیاں نکرو" اب کہتے ہیں "ایسی دیوانی باتیں نہ کرو"۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔ سچ کہئے گا کہ پہلا فقرہ نرم نرم ہے یا دوسرا فقرہ۔

اس ہستیٔ موہوم پہ نازاں نہ ہو غافل — کیوں، اس کی نمائش ہے تماشا گزری گا

اب ایسے موقعے پر کیوں کی جگہ کیونکہ استعمال ہوتا ہے۔

خانۂ دل میں بسا کونسا گلرو ایسا   کہ جو آتا ہے پسینہ تجھے خوشبو ایسا

آج کل خوشبودار کہتے ہیں۔ فارسی میں خوشبودار کو خوشبو اور بدبودار کو بدبو ہی کہتے ہیں۔ حکیم غوث کی ہجو میں سودا نے کہا ہے۔

صورت و شکل اسکی ہے بدبو و قیر   جیسا کہ جلاب کا دست اخیر

"دار" کی شاخ اردو دانوں نے لگائی ہے۔ اچھا کیا۔ اپنا مال ہے چاہے توڑیں چاہے جوڑیں۔ جوڑنے کی مثال تو یہ ہے۔ توڑنے کی مثال بھی دیکھ لیجئے۔

صدمۂ عشق جس بشر کو ہے   شابش اس کے دل و جگر کو ہے

شادباش سے گھٹ کر شاباش ہوا۔ ذوق فرماتے ہیں۔

کیا شاد کو خفیف کرے ہے زبان خلق   شاباش جس کو کہتے ہیں وہ شادباش ہے

اب شاباش سے اور گھٹ کر شابش رہ گیا۔ لکھنے میں شاباش آتا ہے مگر بولنے میں شابش ہی کہتے ہیں۔

کلام کی کمزوریاں | حکیم صاحب کی تعریفیں ہو چکیں۔ اب تھوڑی سی برائیاں بھی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ سب سے زیادہ خرابی تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں تعقید بہت ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے گا تو جو کلام آپ پڑھ آئے ہیں اس میں ہی بیسیوں ایسی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً یہ شعر۔

میں کی گردن پہ چھری۔ یوں کہے خورشید فلک
سامنے میرے۔ رخ یار کا ہمسر میں ہوں

جب عندلیب چمن سے ہوا چمن خالی   تو آ بسے اسے پا، زاغ و زغن اہالی

یا

آدمی کی شکل و صورت سے نہ کہئے آدمی   آدمی جب، آدمی میں آدمیت ہو تو ہو

بات، دراصل یہ ہے کہ باتیں کرنے میں تعقید ونکا خیال نہیں رہتا۔ حکیم صاحب تقریر کو تحریر میں لاتے ہیں

اس لئے یہ الجھاؤ پڑ جاتا ہے۔ بولنے میں یہ چیز عیب نہیں، لکھنے میں عیب ہے۔

ان کے کلام میں سب سے زیادہ قابل اعتراض چیز لفظ "سُنا" کا استعمال ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ ان کا تکیہ کلام تھا یا کیا تھا۔ ایسی ایسی جگہ "سُنا" ٹھونس دیا ہے کہ سُننے کو جی نہیں چاہتا۔ اوپر کے مضمون میں کئی مثالیں اسکی موجود ہیں۔ دو تین اور دیکھ لیجئے۔

بحر میں عالم فانی کے دل اتنا نہ ابھر　　بلبلا کیونکہ ہے انسان "سنا" پانی کا

اسی مضمون میں کسی شاعر نے کیا خوب باندھا ہے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا　　آدمی بلبلا ہے پانی کا:

وہی ہوگا تری قسمت میں جو لکھا ہے سُنا　　بیقراری ہے تجھے اے دل بیتاب عبث

رباعی میں لکھتے ہیں۔

کل بزم میں بھر کے ایک پیالی مے کی　　کرنے لگے یہ صفت کلالی مے کی:

اس دور میں سب کے دعوے جھوٹے ہیں سُنا　　ثابت ہے فقط نمک حلالی مے کی

نمک ڈالنے سے شراب سرکہ بن جاتی ہے اور سرکہ حلال ہے اسطرح شراب کی نمک حلالی ثابت کی ہے۔ اس رباعی میں بھی لفظ "سُنا" موجود ہے خیر یہاں "سنتے ہو" کے معنی تو دیتا ہے دوسری جگہ تو محض بھرتی کا لفظ ہے۔

قصیدہ میں لکھتے ہیں۔

یہ عید جشن کا اس کے مقدمہ ہے سُنا　　اب اس کے جشن کا بھی حال سُن لو بالاجمال

ہر ایک دکھائے ہے باتوں میں باغ سبز سُنا　　جہاں میں بادبہاری کا فیض ہے یہ کثیر

غرض رباعی ہو قصیدہ ہو غزل ہو حکیم صاحب کا "سُنا" کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگا۔ اگر ہدہد کے کلام میں ایک جگہ بھی یہ لفظ آیا ہوتا تو میں تسلیم کر لیتا کہ اس کو حکیم صاحب ہی غزلیں لکھ کر دیا کرتے تھے۔

حکیم صاحب اُردو اور فارسی الفاظ میں واو عطف اور اضافت نہایت بے تکلف طور پر استعمال کر جاتے ہیں، بعض اصحاب اس کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ کیوں۔ جب ہم نے فارسی سے الفاظ لئے اور ان کے ساتھ اضافت اور واو عطف بھی آ گئے تو پھر ہم کو اختیار ہے جس طرح چاہیں ان کو استعمال کریں۔ اُردو میں آنے کے بعد وہ الفاظ اُردو کے ہو گئے۔ فارسی کی ترکیبوں سے ان کو کیا غرض۔ ہمارا مال ہے جسطرح چاہیں استعمال کریں۔ نہیں تو وہ ساس والی مثل ہو گی کہ بہو سے فرماتی ہیں کہ "بیٹیا" گھر بار تیرا ہے، کوٹھری کٹھلے کو ہاتھ نہ لگائیو" آتش نے ایسے اعتراض کرنے والوں کا جواب خوب دیا تھا۔ آپ کا ایک شعر ہے۔

دختر رز میری مونس ہے میری ہمدم ہے میں جہاں گیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

ایک صاحب نے کہا "اُستاد بیگم ترکی لفظ ہے اس کے 'گ' پر پیش ہے 'گ' کو زبر سے باندھنا غلط ہے" آپ بھنگیائے ہوئے بیٹھے تھے جواب دیا "ہاں ٹھیک ہے، ترکستان جائینگے تو بیگُم ہی بولیں گے۔"
حکیم صاحب نے تو یہ غضب کیا ہے کہ ہندی اور فارسی الفاظ کے بیچ میں اضافت دینا تو کیا۔ اُردو کے فقرل اور لفظ میں اضافت ڈال دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک ہی تیر میں شاید ہوا کام عاشق کیونکہ آواز نہیں آئی بس ایک آئے کے بعد

"کام ہونا" کے معنی ہیں "کام تمام ہونا"۔ یہ ٹھیٹھ اُردو محاورہ ہے، انہوں نے اس میں اور عاشق میں اضافت ٹھونک دی ہے، بہت اچھا کیا۔

شتاب دے مئے گلرنگ بھر کے ساغر مے کہ سمت قبلہ سے اُٹھا ہے ابر دھوندوکا

دو فقروں میں واو عطف ملاحظہ ہو۔

عنصر خاک سرد و دل یہ گرم کونسی خاک سے بنا ہے دل

غرض کہاں تک لکھوں سینکڑوں مثالیں ہیں۔ ذرا اہل زباں پھر غور فرمالیں کہ ہندی اور فارسی الفاظ میں اضافت دینے کو آخر کیوں ترک کیا جائے۔ ہماری زبان میں آکر دوسری زبان کا لفظ ہمارا ہو گیا ہے۔ ہم نے گروی نہیں لیا کہ مال پوٹلی میں بندھا مہر لگا ہوا رکھا ہے۔ اگر استعمال کرنا ہو تو پوٹلی کی پوٹلی گلے میں لٹکالیں اور یہ نہ کر سکیں کہ پوٹلی کھول کر جس مال کو جسطرح چاہیں کام میں لائیں۔ اس قسم کے

شرائط اُردو کی راہ ترقی میں روڑے ہیں، ان کا ہٹا دینا ہی اچھا ہے۔

پہیلیاں | حکیم صاحب کے جودت طبع کا اندازہ ان کی پہیلیوں سے ہو سکتا ہے۔ بہت ہیں، اور سب ہندی میں ہیں۔ سودا اور انشار نے بھی پہیلیاں کہی ہیں۔ مگر ان میں اور حکیم صاحب کی پہیلیوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ حضرت امیر خسروؒ کے بعد اگر مزیدار پہیلیاں ہیں تو بس ان کی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند سُن لیجئے۔

نور بصر

ایک پورکھ وہ سب کو دیکھے — اندھے ہیں سب واکے لیکھے
سات پردوں کے اندر رہے — سب کچھ آنکھیں دیکھی کہے

پرچھائیں

ایک ناری کا میلو رنگ — لگی رہی وہ پیا کے سنگ
اجیارے میں وہ سنگ براجے — اندھیارے میں چھوڑ کے بھاجے

چراغ

لال مکٹ سر پر، منہ کالا — ہے وہ اندھیرے گھر کا اجالا

چھتہ مگس

ایک مندر کے سہنسر در — ہر در میں تریا کا گھر
بیچ میں اس کے امرت تال — بوجھ ہے اسکی بڑی محال

امیر خسرو کا رنگ ہے، پہیلی کی بوجھ خود بتا دی ہے، محال مکھیوں کے چھتّے کو کہتے ہیں۔

آسمان

ایک تھال موتی سوں بھرا — سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے — موتی اس سے ایک نا گرے

دسپنا (دست پناہ)

ایک پورکھ کا کا لو رنگ — گول سیس، دو لمبی ٹنگ
نار کو آئے لیت اُٹھائے — پیار کرے اور چمٹا جائے

اس میں بھی بوجھ بتادی ہے۔ چمٹا بھی دستپنے کو کہتے ہیں۔ لفظ نار لکھ کر کیا خوبی سے اشارہ کر گئی ہیں۔

بٹوہ

دا بو رکھ جو ہاتھ لگے تم اس سے اور نہ بولو ہاتھ پکڑ کے بند کرو، اور کان پکڑ کر کھولو

قمری

اک ناری نت رہوے جوگن پی کے کارن بھئی برہ گن
رہوے انگ بھبوت رمائے جھک جھک پی کو کوک سنائے
عربی ہندی کر اک ٹھاؤں اٹھ ری ہا سکھی لکھ اسکا ناؤں

حضرت امیر خسرو کی بھی بعض پہیلیاں اسی رنگ کی ہیں۔ اٹھ کی عربی قمر ہے۔ اس کو ہندی کے لفظ "ری" سے ملاؤ، قمری ہو گیا۔

تاریخیں | حکیم صاحب نے تاریخیں بھی کہی ہیں۔ ان کا نمونہ بھی دیکھ لیجیے۔

تاریخ وفات فخر الشعراء "میر ممنون"

جگت استاد تھا فخر الشعراء اس نے فرمائی جہاں سے رحلت
جو سخن سنج تھے عالم میں انہیں ناگوار ہوئی اس کی فرقت
عیش بھی رکھتا تھا از بسکہ کمال ان سے اخلاص و محبت، الفت
فکر تاریخ میں اس نے جو ذرا عالم غیب سے چاہی ہمت
تو سر لحد سے ہاتف نے کہا میر ممنون علیہ الرحمت

(۱۲۶۰) ہجری

مرے جب مہاراجہ بہندر راؤ تو مغموم سارے حواشی ہوئے
اور احباب بھی ان کے غمناک سب یہ دلی لے تا بہ کاشی ہوئے
اسی غم میں جب سال تاریخ کے تہ دل سے ہم بھی تلاشی ہوئے
تو ہاتف سر رہ سے بولا کہ "عیش" مہاراج بیکنٹھ باشی ہوئے

(۱۲۷۱) ہجری

استاد ذوق کی تاریخ لکھی ہے۔

بگفت از سر درد ہاتف کہ گشتہ　　زبا داجل شمع بزم گل ؛

(۱۲۷۳) ہجری

سید شاہ اللہ صاحب کی تاریخ ہوئی ہے۔

برآورد دودے زجان و بگفت　　بجاں آفریں جان شیریں سپرد

(۱۲۷۳) ہجری

اپنے پیر غلام محمد شاہ صاحب المعروف بہ سکین شاہ کی تاریخ وفات کہی ہے۔

کرد رحلت از جہاں چوں حضرت سکین شاہ　　خار غم در دل خلید از رحلت آں نکات

عیش چوں سال وفاتش خواست از پیر خرد　　"واصل ذات الٰہی" گفت تاریخ وفات

(۱۲۸۵) ہجری

عمر بخش صاحب کے مکان کی تاریخ "حویلی عمر بخش" (۱۲۷۶) ہجری سے نکالی ہے۔

غالب کی تاریخ وفات کہی ہے۔

رکھتی دل خوش تھی وہ سو بادل خوش　　داخل جنت نعیم ہوئے

(۱۲۸۵) ہجری

حکیم صاحب کے دیوان میں مستزاد بھی ہے مخمس بھی ہیں۔ مسدس بھی ہیں۔ مسدس کا نمونہ شہر آشوب میں دیکھ لیا ہوگا مخمس کے بھی دو بند لکھے دیتا ہوں۔

مخمسہ کا نمونہ

حضرت جنید بغدادیؒ کی مناجات۔

"الٰہی واقفی از حال زارم　　تو میدانی کہ جز تو کس ندارم"

پر بند لگائے ہیں، فرماتے ہیں۔

جہاں میں جو کہ ہیں ہوشیار یامست　　ضعیف و ناتواں ہیں یاز بردست

عدم کی رہ میں ہمت سب کی ہے پست　　الٰہی راہ مردن سخت راہ است

تو آساں بگذراں زیں رہگذارم

نہیں ہے کوئی ہرگز تیرا ثانی　　ہے بس ارض و سما کا تو ہی بانی

سوا اس کے ہے باقی سب کہانی الہی گر برانی در بخوانی
تو دانی بندۂ بے اختیارم

قدسی کی مشہور نعت۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کو خمسہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کیا کہوں ذات مقدس تری ایسی ہو نبی کہ ترے شان پہ ہے ہر ایک کی شوکت ہر دبی
انبیا کا ہے یہ ورد سحر و نیم شبی مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

عرش سے فرش تلک ایک تیرا فیض ہی عام ہیں گے گل ابر کرم سے تیرے شاداب تمام
مہر الطاف سے شیریں تری ہر میوۂ خام نخل بستان مدینہ ز تو سر سبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

دل میں شرمندہ نہ کیونکر ہوں میں ای شاہ امم کیوں نہ ہو بار خجالت سے مری گردن خم
چھوٹا منہ اور بڑی بات، کیا میں نے ستم نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

مستزاد کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

سب مرے ظاہر و باطن سے خبردار ہے تو اے مرے یار الٰہ
گرچہ عاصی ہوں و لے خوش ہوں کہ غفار ہے تو ہے ترے ہاتھ پناہ
گرچہ ناکارہ و ناچیز ہوں، پر تیرا ہوں تو ہے معبود میرا
بندہ تیرا ہوں، مرا پیدا کرن ہار ہے تو رکھیو رحمت کی نگاہ

اس تمام مضمون میں میں نے حکیم صاحب کے کلام کے سینکڑوں مختلف نمونے دے دیئے ہیں۔
اس سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ جب تک کسی شاعر
کی پوری غزل نہ دیکھا ئے اس وقت تک اس کے کلام کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس
سے اختلاف ہے۔ کوئی خوش نصیب ہی شاعر ہوتا ہے۔ جس کی دیوان بھر میں کوئی ساری کی ساری غزلیں

مرصع نکل آتی ہو۔ ورنہ یہی ہوتا ہے کہ غزل میں ایک دو شعر اچھے ہوے اور باقی سب بھرتی کے۔
خذ ما صفا دع ما کدر، پر عمل کر کے اچھے شعر چن لو، برے چھوڑ دو۔ مولانا روم نے تو کلام مجید کے
متعلق بھی یہی عمل کیا ہے، فرماتے ہیں۔

من ز قرآں مغز را بر داشتم — استخواں پیش سگاں انداختم

پھر بھی دو تین غزلیں پوری کی پوری لکھ دیتا ہوں تاکہ یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ مضمون
ادھورا رہ گیا۔ غزلیں وہ لیتا ہوں جو دوسرے بڑے شاعروں کی غزلوں پر لکھی ہیں۔ تاکہ یہ الزام نہ لگایا جائے
کہ اچھی اچھی غزلیں چھانٹ کر لکھ دیں۔

غالب کی غزل ہے۔

ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

ذوق فرماتے ہیں۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں تیری ایک خاموشی سب کے جواب میں

مومن کہتے ہیں۔

کیا جانے لکھدیا اسے کیا اضطراب میں — قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں

حکیم صاحب کی اسی زمین میں غزل ہے۔

وہ نالہ، لائے چرخ کو جو انقلاب میں — مسکن ہے اس کا اس دل خانہ خراب میں
کیفیت ایسی ہے نگہ مست خواب میں — زاہد بھی دیکھ لے تو بھائے شراب میں
کیوں کیا کہیں گئے حضرت یوسف جو آب میں — چوری گیا ہے دل جو زلیخا کے خواب میں
شاید کہ عزم کوچہ جاناں ہے دل کو آج — بھیجا ہے پہلے جان کو جو اضطراب میں
گردش ہے اس کی چشم کو مستی میں، یا کہیں — نرگس کا پھول تیر رہا ہے شراب میں
اپنا بھی وقت یاد کرو تم نے شیخ جی — کیا کیا مزے اڑائے ہیں عہد شباب میں
ضبط فغاں سے ڈر یہ مجھے ہے، کہ دل کہیں — سینے کے باہر آ نہ پڑے اضطراب میں
قاتل ہیں عاشق مژہ چشم مست ہوں — خنجر گلے پہ پھیر بجھا کر شراب میں
اسکی گلی میں لاکھوں کی جانیں ہیں پائمال — اے دل بھلا میں آپ ہوں کس حساب میں

افشائے راز عشق کے باعث تمہیں تو ہو | سو بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں
پڑھ اس زمیں میں اور غزل عیش اب تو وہ | گوش فلک نے بھی نہ سنی ہو جو خواب میں

لکھے ہیں زلفوں کو لام اس کے، مناسبت دیں ہیں شام کی بھی
بتاتے مار سیاہ بھی ہیں، کہے ہیں، ہے شکل دام کی بھی
پسند کرلیں خواص اس کو، سمجھ میں آتے عوام کی بھی
غرض ہو سب کے پسند خاطر، یہی ہے خوبی کلام کی بھی
دیا ہے جس مہر وش کو ہم نے دل اپنا، نام خدا وہ وہ ہے
جو دیکھے اس کو تو گم ہو سٹی فلک پہ ماہ تمام کی بھی
نزول غم ان کو، پہلے ہی تھا خزاں کے موسم میں، اور اب اسیر
گلوں کی صحبت میں بلبلوں کو ہوئی ہے شدت زکام کی بھی
چلے تو ہو پر سمجھ کے جانا گلی میں اس بت کے حضرت دل:
جتا دیا ہے یہ ہم نے تم کو وہاں ہے رسم اہتمام کی بھی
چلے ہیں کعبے کو شیخ صاحب، کہیں ہیں بیت الصنم میں ایسا
کہ واں تو جائیں گے وہ، ولیکن خبر ہے یہاں ایک مقام کی بھی
یقین ہو وعدہ یہ کیونکہ ان کے کیا نہ ایفا کبھی انہوں نے
ہزاروں قسمیں وہ کھا چکے ہیں گے پہلے تیسوں کلام کی بھی
نگیں کو حاصل ہے روسیاہی، جہاں میں ہر چند ہم نے مانا
یہ واقعی ہے ولے جو دیکھو تو بات ہے اس میں نام کی بھی
گیا جو قاصد پیام لے کر ہماری جانب سے پاس اس کے
پیام کیسا، ہوئی اجازت نہ اس کو ہرگز سلام کی بھی
تیرا بھی وحشت زدہ ہے ایسا کہ جو کڑی گم ہو آہوؤں کی
جو دشت وحشت میں دیکھ لیں چال تیرے وحشت خرام کی بھی

لکھے ہیں اے دعیش، جس زمیں میں یہ شعر تو نے ، سنا ہے ہم نے
کہ اس سے پہلے غزل اسی میں ہے دمیر، عالی مقام کی بھی

مقابل اس در دنداں کے یہ گہر کیا ہے
اور دعیش، لعل کی اس لب کے آگے قدر کیا ہے

خیال یار میں ہوں محو بے خودی ایسا
مجھے خبر نہیں دل کیا ہے اور جگر کیا ہے

کہے ہے عشق میں ناصح کہ ہے ضرر دل کا
جو واقعی ہے ضرر یہ ہی، تو ضرر کیا ہے

کیا ہے نوح کے طوفاں کو تو نے شرمندہ
ارادہ اب ترا کہو اور چشم تر کیا ہے

تو میری آہ سے سینہ سپر نہ ہوا ے چرخ
تجھے خبر نہیں اس آہ میں اثر کیا ہے

تو راہ عشق کے صدموں سے مت ڈرا واعظ
جو سر فروش ہیں اس رہ میں ان کو ڈر کیا ہے

تو کس گھمنڈ پہ مثل شرر اچھلتا ہے
خیال دل میں تو کر ہستی شرر کیا ہے

خدا نے کھولا ہے یہ راز جن پہ عالم میں
وہ جانتے ہیں کہ ماہیت بشر کیا ہے

بتوں کے سجدہ در کے سوا، بتا ای دعیش،
جہاں میں تو نے کیا اور عمر بھر کیا ہے

مجھ سے پوچھیں ہیں وہ کہ کیا ہے دل
کیا کہوں خانۂ خدا ہے دل

تیری فرقت میں اے بت دمساز
ہو کے آنکھوں سے خوں بہا ہے دل

مل گئے اس سے ہوا مرا دشمن
دیکھو کیا سخت بے وفا ہے دل

عنصر خاک سرد و دل یہ گرم
کون سی خاک سے بنا ہے دل

اے مہوس جو یار کے در پہ
خاک ہووے تو کیمیا ہے دل

غم ہجراں میں ہو کے قطرۂ خوں
نوک مژگاں پہ آ رہا ہے دل

سینہ میں ایک کھٹک سی ہے اور بس
ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے دل

یاد میں اس کے تیر مژگاں کے
ہدف ناوک بلا ہے دل

تجھ سے کوئی بھلا ملے کیونکر
تیرا ہر حرف خود جدا ہے دل

قدر دل کوئی دعیش، کیا جانے
مخزن راز کبریا ہے دل

لیجیئے یہ ہیں حکیم آغا جان وعیش، دہلوی اور یہ ہے اُن کا کلام - اچھے بُرے کا اندازہ آپ کر لیجئے - ہم تو یہی کہتے ہیں کہ زبان اُردو پر اُن کا بڑا احسان ہے - اِنہی لوگوں نے زبان کو مانجھا محاورروں کا ہمکو صحیح استعمال بتایا، رعایت لفظی سے زبان کو پاک صاف کیا، شوخی مضامین سے کلام کو آراستہ کیا، اسی دشت نوردی میں ساری عمر گذار دی اور چلتے چلاتے اپنی کمائی پنڈل میں باندھ ہم کو دے گئے کہ لو بھئی یہ تمہارا مال ہے - اب تم جانو اور تمہارا کام جانے - سنبھال کر رکھا اور اس مال میں اضافہ کیا تو ہمارا بھی نام رہ جائے گا تمہارا بھی نام ہو گا - نہیں تو جس طرح دہلی کھو بیٹھے اسی طرح زبان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے -

---

انتہا

لیجئے مضامین فرحت کا حصۂ دوم بھی ختم ہو گیا - ابھی بہت سے مضمون چھپنے سے رہ گئے ہیں اگر آپ صاحبوں نے قدر کی تو شاید کبھی نہ کبھی تیسری جلد بھی چھپ جائے - اور آپ کو پھر کچھ خرچ کرنے کی نوبت آئے - نہیں تو ہم اپنے گھر خوش اور آپ اپنے گھر خوش - والسّلام -

مرزا فرحت اللہ بیگ